ISSN 0974-7346

ستمبر ۲۰۲۴ء

جلد ۲۱۱ — عدد ۹

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY,

AZAMGARH

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۳۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۳۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگرممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۳۵۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔
اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

(Ma'arif Section) 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپواکر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۱	ماہ صفر المظفر ۱۴۴۶ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۲۴ء	عدد ۹

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر:۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

ایک گمان تھا کہ پارلیمانی انتخاب کے نتائج کے بعد نفرت کی سیاست میں کچھ کمی آئے گی اور ایک جمہوری ملک کے قانون کی قسم کھا کر حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے والے اپنی خطاؤں کمیوں اور زیادتیوں پر دوبارہ نظر ڈالیں گے۔ لیکن جب شخص، جماعت اور تنظیم سب کے سب اسی پندار کے شکار ہوں جو وقت کے ہر قاہر اور جابر حکمران کی شناخت بنتا رہا ہے تو اصل قادر مطلق کے دیے ہوئے اشاروں کی ناقدری کے سوا کسی بہتری اور بھلائی کی امید اور گنجائش کہاں؟۔ مسجد، مدرسہ، زبان، مذہب، تہذیب، معاش و معاشرت سب پر نشتر زنی کے بعد رسم ورواج اور عائلی قانون کے بہانے نیش عقرب والی ایذا رسانی کی عادت نے اب ایک اور نیا زخم وقف کے مسئلہ کی شکل میں دیا، اس کے آثار تو سابقہ پارلیمنٹ میں حکمران جماعت کے بعض ارکان کی زبان سے ظاہر ہونے لگے تھے کہ اب وقف کا وقت گیا، مگر احساس ہزیمت نے اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے حکمران طبقہ کو وقف کے قانون میں نئی ترمیموں کو شامل کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اصلا یہ رویہ آمرانہ اور جابرانہ طرز حکومت کی وہ پہچان ہے جس میں کم اور کمزور طبقات کی محکومانہ بے چینیوں کے ذریعہ زیادہ تعداد اور زیادہ زور والوں کو نفسیاتی برتری کا چین دلانے کی نیت کارفرما ہوتی ہے۔

***

اوقاف یا عمل وقف کے متعلق یہ بات کہی اور سمجھی جاتی ہے کہ اسلام نے قانون کے اس شعبہ کو دینی اور دنیوی فلاح کا ضامن بنادیا ہے، یعنی جائیداد کو وقف کر کے اس کی ملکیت کو اس کے اصل مالک کی تحویل میں اس نیت کے ساتھ منتقل کیا جاتا ہے کہ اس کا منافع اس کی مخلوق کے فائدے کے لیے صرف کیا جائے، دنیاوی پہلو فائدہ کا یہ ہے کہ وقف ہونے کے بعد جائیداد ناقابل انتقال اور بربادی سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ وقف میں زیادہ معروف قسم وقف علی الاولاد کی ہے، دین وشریعت کے تمام احکام و معاملات کی طرح وقف پر عمل ہوتا رہا اور یہ شعبہ کبھی حکومتوں کی مداخلت یا بے جا قانون سازی کے دائرے میں نہیں آیا، لیکن ہندوستان میں جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو بعض خاندانوں میں نزاع ہونے کی وجہ سے سرکاری عدالتوں میں مقدمے دائر ہوئے، نتیجے میں انگلینڈ کی پریوی کونسل نے ۱۸۹۴ میں وقف علی الاولاد، جو سب سے زیادہ رواج میں تھا، اس کے جواز کو گویا کالعدم کر دیا۔ حاکم و محکوم کی اس آویزش نے اس مسئلہ کو قومی اہمیت دی، جس کا اندازہ علامہ شبلی کی تحریروں سے ہوتا ہے بلکہ اندازہ ان کی فکر اور اضطراب کا ہوتا ہے، انہوں نے مقدور بھر وقف کے

مسئلہ کو ملک گیر بنانے کی پہل کی اور ایک تجویز یہ پیش کی کہ وقف کی ایک مجلس زیر حمایت ندوہ قائم کی جائے اور ہندوستان کی تمام مقتدر مجالس سے اس میں مدد لی جائے۔ علامہ کی فکر اور کوششوں کا نتیجہ ۱۹۱۳ء میں "قانون جواز اوقاف مسلمانان" کی شکل میں سامنے آیا، جس کے لیے محمد علی جناح کی کوششوں کی بھی ستائش کی گئی، یہاں تفصیلات کی ضرورت نہیں لیکن اسی زمانہ کے ایک رسالہ کی تحریر آج سے ۱۰۰ سال سے بھی زیادہ پہلے کے ہندوستان کی تصویر بن کر سامنے آتی ہے۔ میرٹھ کے ایڈووکیٹ مولوی محمد اسماعیل حنیفی نے یہ رسالہ تحریر کیا، اس میں یہ عبارت بھی ہے کہ "مسلمانان ہند تباہی کے عمیق غار کے کنارے پر کھڑے ہوئے ہیں اور خفیف حرکت درکار ہے جو ان کو اس غار کے اندر اس طرح ڈھکیل دے کہ ان کی ہڈیوں کا سراغ بھی ملنا مشکل ہو جائے" ایک غاصب اور مغرور اور متعصب حکومت کے دور میں ایسی آوازوں کا بلند ہونا یقیناً وقت کا تقاضا تھا، جس کا اثر بھی ہوا کہ حکومت کا فیصلہ تبدیل ہوا لیکن جابرانہ فطرت بہرحال تبدیل نہیں ہوئی، ۱۹۲۳ یعنی آج سے ٹھیک سو سال پہلے انگریز حکومت نے پھر ایک قانون اوقاف تیار کرنے کی کوشش کی جس کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا کہ یہ مذہبی مداخلت کا خطرہ لیے ہوئے ہے اور یہ مسلمانوں کی متفقہ خواہش کے اظہار کا خیال کیے بغیر ہے۔ سید صاحب کو تعجب ہوا کہ یکایک اس انقلاب حال کی وجہ کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ اس انقلاب حال کے پیچھے چند اپنے ہی تھے، سید صاحب نے لکھا کہ اس میں شک نہیں کہ متولی اوقاف کی آمدنی کو ذاتی اغراض میں صرف کرتے ہیں، مگر شاید حکومت بھی اس اعتراض سے بری نہیں کہ جن اوقاف کی نگرانی حکومت کے ہاتھ میں ہے، کیا ان کے محاصل گورنمنٹ پرستوں کی پرورش، وفاداروں کے انعام واکرام، قرض ہائے جنگ اور دیگر ان مدوں میں صرف نہیں کر دیے جاتے جن کے لیے حکام کے سرکاری بجٹ میں رقم نہیں۔ ظاہر ہے یہ خوف اس وقت بھی درست تھا اور ۱۰۰ سال بعد نیت اور مقصد میں آج بھی وہی یکسانی اور اشتراک ہے، اس لیے ایک سامراجی حکومت کے نقوش کو رام راجی اقتدار میں پھر سے زندہ کیے جانے کا خوف بالکل بجا ہے۔

***

آزادی کے بعد زیادہ تر کانگریس کی حکومت رہی، اس دور میں بھی وقف کے قانون میں ترمیم کا خیال اکثریت نواز حکمرانوں کو بے چین کیے رہا، ۲۰۱۰ میں ایک اور ترمیم شدہ وقف ایکٹ کا پتہ چلتا ہے جس کی مخالفت مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس لیے کی تھی کہ اس میں بعض دفعات شریعت کی نظر سے غیر واجب تھیں، مثلاً وقف کی تعریف ہی درست نہیں تھی کہ وقف کوئی مسلمان ہی کر سکتا ہے، بورڈ کا کہنا تھا کہ وقف کرنے والا کسی مذہب کا بھی ماننے والا ہو سکتا ہے، اسی طرح یہ دفعہ بڑھائی

گئی کہ رجسٹرڈ وقف ہی کو قانونی چارہ جوئی کا حق حاصل ہوگا جبکہ بہت سے اوقاف رجسٹرڈ نہیں کرائے گئے، مگر وہ وقف ہیں، اب ان کی قانونی حیثیت کمزور ہو جائے گی۔ بہرحال ۲۰۱۰ء کے اس ترمیمی ایکٹ کے خلاف مسلم پرسنل لا بورڈ نے کامیاب چارہ جوئی کی اور ۲۰۱۳ء میں وہ وقف ترمیمی بل منظور ہو گیا، جس کے لیے مسلم پرسنل لا بورڈ نے محنت کی اور اس زمانے کے اقلیتی امور کے وزیر جناب کے. رحمان خان نے اس کے لیے بڑی کدوکاوش کی گو یہ بل بھی پوری طرح قابل اطمینان نہیں تھا تاہم بقول مولانا ولی رحمانی مرحوم تازہ ایکٹ بہتر ہے۔ زیادہ بہتر بل کی تیاری تھی اور یقین تھا کہ یہ اصلاح شدہ بل پارلیمنٹ میں منظور ہو جائے گا، مگر ۲۰۱۴ء آتے آتے زمین آسمان ہی بدل گئے، حکومت ان کے ہاتھوں میں آئی جو شروع سے اقلیت کو غیر سمجھتے تھے، انہوں نے اپنے ترکش میں وہ تمام تیر جمع کر رکھے تھے جن سے پہنچنے والے زخموں سے ان کے اقتدار کی کھیتی ہری ہوتی رہے اور یہ نیا وقف ترمیمی بل بھی ان ہی تیروں میں ہے۔ اس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ اس سے اوقاف کا نظام صاف اور شفاف ہوگا، کابینہ کو تو بے سوچے سمجھے منظوری دینا ہی تھی لیکن جب یہ پارلیمنٹ کی منظوری کے لیے سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ صیادوں نے صرف جال ہی نہیں بچھایا بلکہ قریب ڈیڑھ سو سال پہلے جس طرح ایک غیر ملکی اقتدار کے مقصد سے بھانپنے والے سمجھ گئے تھے کہ یہ ایسے عمیق غار کی تیاری ہے جس کو صرف زندہ درگور ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، وہی غار اب پھر درپیش ہے اصلاح کے نام پر حکومت کی وہ نیت اور زیادہ واضح ہو گئی جو پہلے بھی کبھی غیر واضح نہیں تھی، ماہرین نے بتایا کہ اس نئے ترمیمی بل کا مقصد اور واحد مقصد مسلمانوں کی وقف املاک کو ہڑپنا ہے۔ اس کو قومیانے کی سازش ہے کہ کنٹرول بس ایک طبقہ کا رہے، یہ مسلمانوں کے قانونی اثاثوں کی قانون کے نام پر لوٹ ہے، اس میں قریب چالیس ترمیمات ہیں۔ کئی شقوں کو منسوخ کر کے رجسٹریشن کے نام سے بھی اور مرکزی اور ریاستی وقف بورڈوں میں غیر مسلم ایگزیکیوٹو آفیسر اور کم از کم دو غیر مسلم ممبران کی تقرری بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ضلع کلکٹر کو یہ اختیار بھی کہ وہ فیصلہ کرے کہ کون سی جائیداد وقف ہے اور کون نہیں؟ حزب مخالف کی مخالفت کے بعد ابھی یہ ایک کمیٹی کے زیر غور ہونے کی وجہ سے معرض التوا میں ہے لیکن آنے والی قیامت کی فکر کرنے والوں کو قوم ڈھونڈتی ہے کہ کہاں ہیں شبلی، کہاں ہیں رحمانی؟

***

خانزادہ بیگم: بابر کی محسن بہن

پروفیسر شریف حسین قاسمی، دہلی یونیورسٹی، دہلی
shqasemi@yahoo.com

ظہیر الدین محمد بابر (پیدائش، ۶؍محرم ۸۸۸ھ / ۱۴/ فروری ۱۴۸۳ء) بارہ برس سے کم عمر میں سہ شنبہ ۵؍رمضان ۸۹۹ / ۱۴۹۴ میں اندجان (سمرقند) میں تخت نشین ہوا، اس کی زندگی اپنے تخت و تاج کو بچانے کے لیے بڑی دشوار راہوں سے گزری۔ ہندوستان آنے سے پہلے اسے متعدد بار کامیابیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک بار وہ نامساعد حالات کی بنا پر تخت و تاج ترک کر دینے اور ایک درویش کی زندگی گزارنے کی سوچ رہا تھا۔ ایک بار سمرقند میں ازبک فرمانروا شیبانی خاں سے شکست کھانے کے بعد وہ اپنی زبوں حالی خود یوں بیان کرتا ہے:

> نہ میرے پاس کوئی ولایت تھی اور نہ ملنے کی امید۔ میں اکثر و بیشتر پریشان حال و سرگرداں رہتا تھا۔ بہت سے لوگ مجھ سے علاحدہ ہو گئے تھے اور جو چند رہ گئے تھے وہ بھی میری قلاشی کے باعث ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ میں اس طرح کی سرگردانی اور خانہ ویرانی سے تنگ آ جا چکا تھا۔ اب تو یہ جان بھی مجھے عذاب لگنے لگی تھی۔ میں خود سوچتا تھا کہ اس دشواری و پریشانی کے ساتھ زندہ رہنے سے بہتر ہے کہ جدھر بھی منھ اٹھے، اسی طرف نکل جاؤں اور خود کو نیست و نابود کر لوں۔ جہاں تک میرے یہ پاؤں ساتھ دیں، میں چلتا جاؤں تاکہ لوگ میری اس ذلت و خواری اور گریہ وزاری کے بارے میں تو نہ جان سکیں[1]۔

اس وقتی صورت حال کے باوجود قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور اس کا آہنی عزم اسے ہر قسم کے جان لیوا بھنور سے نکال کر کامیابی کے کنارے لا کر کھڑا کر دیتا تھا اور بابر پھر سے پورے انہماک اور جذبے کے ساتھ سر پر تاج رکھے تخت سلطنت پر نظر آتا اور حکومت کے کاموں میں مشغول ہو جاتا تھا۔ یہ بابر کا عزم ہی تھا جس کی وجہ سے وہ ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی ہوا۔ اور یہاں

---

[1] وقائع بابر: ظہیر الدین محمد بابر، اردو ترجمہ: یونس جعفری، حواشی و جزئیات حسن بیگ، شہر بانو پبلشرز، برطانیہ، ۲۰۰۷ء، ص ۱۸

۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء سے ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء تک حکومت کرتا رہا۔ بابر آگرہ میں ۴۸/ برس کی عمر میں ۶/ جمادی الاول ۹۳۷ھ (= بہشت روزی یاد) / ۲۶/ دسمبر ۱۵۳۰ء کو فوت ہوا۔ وفات کے بعد اسے "فردوس مکانی" کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ بابر کو پہلے اسی کے تعمیر کردہ "آرام باغ" آگرہ میں پھر کابل میں دفنایا گیا۔ یہاں اب ایک عالی شان باغ ہے جسے باغ بابر کہا جاتا ہے۔

بابر نے وقائع بابر (توزک بابری) میں اپنے افراد خانوادے کا تعارف کرایا ہے۔ جو ہر مشکل وقت میں اس کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی:

بابر کے والد عمر شیخ مرزا ولد ابو سعید مرزا ولد محمد مرزا ولد میران شاہ ولد امیر تیمور گورگانی کی سات بیگمات تھیں۔ ان میں قتلق نگار خانم (متوفی یکم محرم ۹۱۱ھ / ۶/ جون ۱۵۰۵ء، مدفن باغِ نوروز، کابل) مغولستان کے حاکم یونس خاں ولد ویس خاں کی لڑکی تھیں، یہی بابر کی والدہ تھیں۔

ایسن دولت بیگم بابر کی نانی تھیں، یہ نہایت دلیر، دور اندیش اور مدبّر خاتون تھیں۔ حکومت کے اکثر کام انہی کے مشورے سے انجام پاتے تھے[۲]۔

قتلق نگار خانم سے بابر کے علاوہ ایک لڑکی خانزادہ بیگم بھی تھیں، جو بابر سے پانچ برس بڑی تھیں۔ بابر اور ان کی بہن خانزادہ بیگم کی عمروں میں پانچ سال کا فرق یہ بتاتا ہے کہ اس بڑی بہن نے خارج از امکان نہیں کہ اپنے چھوٹے بھائی کی پرورش میں بھی کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہو اور ان دونوں میں محبت و خلوص کا غیر معمولی رشتہ استوار ہو گیا ہو۔ روزمرہ کی زندگی میں دیکھنے میں آتا ہے کہ عام طور پر بھائی بہن ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ محبت اور خلوص کے اس غیر معمولی جذبے کے تحت بابر کی اس بہن نے اپنے بھائی بابر کی زندگی بچانے کے لیے جو قربانی دی اور فداکاری کا جو ثبوت دیا، اس کی روداد سننے کے قابل ہے:

بابر نے وقایع بابر کے شروع ہی میں ۹۰۷ھ / ۱۴۰۱ء کے واقعات میں لکھا ہے کہ:

دوسری مرتبہ سمرقند پر قبضہ کرنے کے لیے میں نے حملہ کیا تو اگرچہ سرپل پر مجھے شاہی بیگ خان شیبانی[۳] سے شکست ہوئی، لیکن اس کے باوجود میں پانچ ماہ تک قلعہ (سمرقند) پر قابض رہا۔ جب

---

[۲] مرزا محمد حیدر دوغلات، تاریخ رشیدی: تصحیح دکتر عباس علی غفّاری فرد، میراث مکتوب، تہران، ۱۳۸۳ء، ص ۹۴، شاہنواز خاں، مآثر الامرا: تصحیح مولوی عبد الرحیم، کلکتہ، ۱۸۹۰ء، ج ۳، ص ۶۱، وقایع بابر: حاشیہ ص ۱۰

[۳] محمد شیبانی خاں چنگیز خاں کے بیٹے جوچا اور اس کے بیٹے شیبان کی اولاد میں سے تھا۔ ۸۵۵ / ۱۴۵۱ میں پیدا ہوا تھا۔ بڑے عزائم کا شخص تھا۔ بابر سے اس کا چند مرتبہ مقابلہ ہوا اور بابر کو اس کی وجہ سے بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ شیبانی نے جس سلطنت کی بنیاد رکھی اس میں سولہویں صدی میں ماوراء النہر اور بلخ شامل تھے۔ یہ مرو میں شاہ

اطراف وجوانب کے حکمرانوں اور سرداروں سے مجھے کسی قسم کی کوئی مدد نہیں ملی، کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا اور ایک ایک کرکے میرے ساتھی میرا ساتھ چھوڑنے لگے، تو اسی اثنا میں شیبانی خان کی طرف سے صلح وآشتی کی بات شروع ہوئی۔ اگر کسی طرف سے مدد کی امید ہوتی اور سامان رسد پہنچ گیا ہوتا تو صلح کی بات پر کون کان دھرتا۔ چنانچہ وقت کا تقاضا تھا کہ صلح کرلی جائے، صلح کرلی گئی اور دوپہر رات گزرنے کے بعد میں قلعہ کے دروازۂ شیخ زادہ سے باہر آگیا۔ یہ سیاہ رات تھی، بابر راستہ بھٹک گیا اور سند کی شاہ نہر کے آس پاس سرگرداں رہا۔ (۴)

بابر اسی بیان میں اضافہ کرتا ہے:

میری والدہ کے علاوہ دو دیگر خواتین میرے ہمراہ تھیں۔ ان میں ایک بیچ کا خلیفہ اور دوسری منگلیگ کوکلتاش تھیں۔ جس وقت میں قلعے سے باہر نکل رہا تھا میری بڑی بہن خانزادہ بیگم اس بھگدڑ میں رہ گئیں اور شیبانی خان کی گرفت میں آگئیں۔ (۵)

وقایع بابر میں دوبار یہی مذکور ہے کہ خانزادہ بیگم قلعے سے باہر نکلتے وقت قلعے میں رہ گئیں اور اس کے مخالف حکمران شیبانی خان کے ہاتھ لگ گئیں۔ یہاں بابر حقیقی صورت حال کا اظہار نہیں کررہا ہے بلکہ وہ سچ بتانے کی ہمت نہیں کرپارہا ہے۔ وہ خود وقایع بابر میں ۹۰۷ھ کے وقایع کے ضمن میں کہتا ہے کہ اس نے شیبانی خان سے ایک معاہدے کے بعد قلعہ خالی کیا تھا اور اپنی جان بچا سکا تھا۔ اس معاہدے کی ایک شق یہ تھی کہ بابر اپنی بڑی بہن خانزادہ بیگم کی شیبانی خان سے شادی کی اجازت دے دے گا۔ بابر اس کا ذکر نہیں کرتا۔ اسی معاہدے کی وجہ سے خانزادہ بیگم بابر کے قلعہ خالی کرنے سے پہلے ہی شیبانی خان کے پاس چلی گئی تھی، اور اس سے شادی کرلی تھی۔ اس کے بعد ہی بابر قلعے سے باہر آسکا تھا۔ خانزادہ بیگم کا شیبانی خاں سے معاہدے کے مطابق شادی کرلینا گویا بابر کی زندگی کی قیمت تھی اور بابر کی اس بڑی بہن نے یہ ایثار اور بابر پر احسان کیا ورنہ سمرقند میں محاصرے سے بابر کا زندہ نکل آنا ممکن نہیں تھا۔

ظاہر ہے بابر معاہدے کی اس شق کا اس وجہ سے ذکر نہیں کررہا ہے کہ یہ بابر کے لیے نہایت باعث شرمندگی اور اس شجاعت ومردانگی کے خلاف تھا جس کے لیے بابر معروف ہے۔ مزید برآں بابر یہ بھی جانتا تھا کہ اس معاہدے پر اس کے خاندان کے لوگ اسے طعنے دیں گے اور برا بھلا کہیں

اسماعیل صفوی سے مقابلے میں ۹۱۶ / ۱۵۱۰ میں ۶۱ / برس کی عمر میں مارا گیا۔ تاریخ رشیدی، ص ۱۶۶

(۴) وقائع بابر، ص ۷۵-۷۶

(۵) ماخذ سابق، ص ۷۵

گے۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ بابر کے اس معاہدے پر پورے خاندان کا یہ رد عمل تھا:

بابر جب محاصرے سے نکل جانے کے بعد تاشقند میں اپنے بڑے سوتیلے ماموں سلطان محمود خاں سے ملتا ہے تو وہ بابر سے کہتے ہیں کہ: بدبخت خانزادہ بیگم کس بلا میں گرفتار ہوگئی۔ شیبانی خاں تو مکّار انسان ہے، شاہزادہ اپنی ماں کی طرف سے ہماری اولاد کی طرح ہے اور والد کی طرف سے تیموریوں سے اس کا تعلق ہے۔ شیبانی جانتا تھا کہ اگر وہ خانزادہ کو اپنے قبضے میں کر لے گا تو اس کی آبرو اور حیثیت میں اضافہ ہوگا۔ اس نے بڑی شان و شوکت سے خانزادہ سے سمرقند میں شادی کرلی۔[۶]

بابر کے ماموں محمود خان کی ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ بابر نے محاصرے سے رہائی کے لیے اپنی بہن کو قربان کر دیا اور یہی سچ بھی ہے۔

اس پر بابر نے کچھ وضاحت کی تو سلطان محمود خاں اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور کہا: "بابر! شرم کی بات ہے، ہم سب کے لیے اور تمہارے لیے بھی۔ ہم پر ملامت جائز ہے"۔ اس پر بابر جواب دیتا ہے: "وقت نے میرے سر پر تاج رکھا تھا، لیکن اب ملامت اور طعنوں کے پتھر برسا رہا ہے۔ مجھے ان حالات نے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ حضرت خان! میرے پاس اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں کہ کسی طرف نکل جاؤں"۔[۷] یہ بابر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، اس لیے تاریخ کی مختلف کتابوں میں اس کا ذکر نظر آتا ہے۔

مرزا محمد حیدر دوغلات بابر کی خالہ کا لڑکا ہے۔ خالہ زاد بھائی ہے، یعنی بابر کے خاندان کا ایک فرد ہے۔ وہ اصل صورت حال سے واقف تھا۔ دوغلات لکھتا ہے کہ "بابر کے ساتھ شیبانی خاں نے ایک معاہدہ کیا۔ خانزادہ بیگم کی شیبانی خاں سے شادی کی اجازت اس کا حصہ تھا۔ اور اس طرح بابر نے اپنی جان بچائی تھی۔[۸] بڑی بہن خانزادہ بیگم نے اپنے بھائی کے لیے یہ ایثار کیا اور قربانی دی تھی"۔ بابر کی بیٹی گلبدن بیگم ہمایوں نامہ میں اس واقعہ کے بارے میں صحیح لکھتی ہے کہ یہ سب کچھ ایک مجبوری کے تحت کیا گیا، یعنی معاہدہ کیا گیا اور اس میں یہ شرط قبول کرلی گئی کہ خانزادہ بیگم کی شادی شیبانی خاں سے کر دی جائے گی۔ گلبدن بیگم کا یہ سب سے زیادہ متوازن اور حقیقت پر مبنی بیان ہے ورنہ جو کچھ اس سلسلے میں بعض دیگر کتب تاریخ میں نظر آتا ہے وہ بابر کو ایک نازیبا الزام سے بچانے کی کوشش ہے۔

---

[۶] وقایع بابر، ص۴۶۶

[۷] وقایع بابر، ص۴۱۷

[۸] تاریخ رشیدی، ص۱۷۵، ۲۶۶، ۳۷۰

فرشتہ اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ بابر کی بہن خانزادہ بیگم سمرقند کے محاصرے کے وقت شیبانی خاں کے ہاتھ لگ گئی اور اس نے خانزادہ بیگم سے شادی کرلی۔[۹]

اسٹینلی لین پول Stanley Lanepool نے بھی اپنی کتاب Babar میں محمد صالح کنبو کے حوالے سے لکھا ہے کہ خانزادہ بیگم شیبانی خاں سے محبت کرتی تھی اور شادی کے بعد شیبانی کا خانزادہ کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کے بعد شیبانی خاں نے خانزادہ کو طلاق دے دی۔ اسٹینلی لین پول نے یہ اضافہ کیا ہے کہ شیبانی نامہ میں وضاحت سے لکھا ہے کہ اس معاہدے میں یہ شرط شامل تھی کہ خانزادہ بیگم شیبانی خاں سے شادی کرے گی اور اس کے بعد بابر محاصرہ سے باہر آسکے گا۔[۱۰]

لین پول کے بقول محمد صالح کنبو نے لکھا ہے کہ خانزادہ بیگم اور شیبانی خاں کے درمیان محبت تھی۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ ان دونوں میں چوں کہ محبت تھی اس لیے خانزادہ بیگم کسی کو بتائے بغیر قلعے سے باہر چلی گئی اور شیبانی سے شادی کرلی، اس میں بابر کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔

بابر اسی واقعہ کے بارے میں مزید لکھتا ہے کہ شاہی بیگ خاں (شیبانی خاں) سے خانزادہ بیگم کے بطن سے ایک لڑکا خرم شاہ پیدا ہوا تھا۔ یہ بڑا ہی قبول صورت بچہ تھا۔ اس کے باپ شیبانی خان نے ولایت بلخ اس کے نام کردی تھی۔ باپ کی وفات کے ایک دو سال بعد یہ بچہ بھی فوت ہوگیا تھا۔[۱۱]

جس وقت شیبانی خاں نے خانزادہ بیگم سے شادی کی ہے، اس وقت بابر کی والدہ کی بڑی بہن اور خانزادہ بیگم کی خالہ مہر نگار خانم شیبانی خاں کے نکاح میں تھی اور سمرقند میں مقیم تھی۔ شیبانی خاں نے مہر نگار خانم کو طلاق دے دی اس لیے کہ ایک ہی وقت میں دونوں خالہ اور بھانجی کسی ایک شخص کے نکاح میں نہیں رہ سکتی تھیں۔ بہر حال مہر نگار خانم اس کے بعد بھی سمرقند ہی میں مقیم رہیں۔[۱۲]

خانزادہ بیگم کے بطن سے شیبانی خاں کے لڑکے خرم شاہ کی پیدائش کے بعد شیبانی خاں کی نظر میں خانزادہ بیگم کی شخصیت مشکوک ہوگئی تھی۔ وہ اس وہم میں مبتلا ہوگیا تھا کہ ممکن ہے خانزادہ بیگم کسی وقت اپنے بھائی بابر کی خاطر اس کی زندگی لینے کا قصد کرے۔ اس لیے اس نے خانزادہ بیگم کو

---

(۹) تاریخ فرشتہ: ترتیب و تصحیح، دکتر محمد رضا نصیری، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی ایران، تہران، ۱۳۸۸، ج ۲، ص ۲۷

(۱۰) Stanley Lanepool, *Babar,* S. Chand and Co. Delhi, 1975, p 59

(۱۱) تاریخ بابر، ص ۶-۷

(۱۲) وقایع بابر، ص ۶۷، تاریخ رشیدی، ص ۱۵۹، ۳۲۲

طلاق دے دی اور اسے سادات اتا ئی میں ایک عظیم المرتبت شخص سید ہادی کو بخش دیا۔ سید ہادی تمام ازبک فرمانرواؤں میں محترم تھے۔ یہ مرو میں ایرانیوں سے ہونے والی جنگ میں شریک تھے، اور خانزادہ بیگم ان کے ہمراہ تھیں۔ بابر اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ جب مرو پر قبضہ کرنے کے لیے شاہ اسماعیل صفوی (حکومت: ۱۵۰۱/۹۰۹-۹۳۰/۱۵۲۴) نے حملہ کیا تو اس وقت خانزادہ بیگم وہیں تھیں۔ میری خاطر شاہ اسماعیل صفوی نے خانزادہ بیگم کے ساتھ خوش اسلوبی کا برتاؤ کیا۔ پہلے ایک ایلچی بابر کو اطلاع دینے کے لیے کہ تمہاری بہن مرو سے تمہارے پاس بھیجی جارہی ہے، بابر کے پاس آیا۔ اس کے بعد بابر اپنی بہن سے ملنے دوڑے دوڑے قندوز پہنچا۔ محمد کوکلتاش بابر کے ہمراہ تھا۔ بابر کو اپنی اس بہن سے جدا ہوئے دس برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ خانزادہ بیگم اور جو لوگ ان کے ہمراہ تھے، بابر اور محمد کوکلتاش کو پہچان نہیں سکے۔ جب بابر نے اپنا تعارف کرایا تو تھوڑی دیر بعد خانزادہ بیگم بابر کو پہچان سکیں۔[۱۳]

بابر نے اپنی بہن کے پہنچنے کے بعد ایک سفیر مرزا خاں کو شاہ اسماعیل کی خدمت میں اطاعت کے عہد اور مدد کی درخواست اور بہت سے تحفے تحائف کے ساتھ بھیجا تھا۔ شاہ اسماعیل صفوی نے بابر کے سفیر کا خوش اسلوبی سے استقبال کیا اور بابر کی التماس کو قبول کرلیا اور سفیر کو جلد ہی واپسی کی اجازت دے دی۔[۱۴]

اس کے بعد خانزادہ بیگم کابل آگئیں اور بیمار ہو گئیں۔ بابر نے اپنی بہن کو ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے خط لکھا اور دوغلات سے، جو ان کا خالہ زاد بھائی تھا، کہا کہ وہ خانزادہ بیگم سے ان کی بیماری اور مرض کے علاج کے بارے میں استفسار کرے۔[۱۵]

خانزادہ بیگم کے اس سے زیادہ احوال معلوم نہیں ہوسکے۔ شاید اسی بیماری میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہ بابر کے ہندوستان فتح کرنے کے وقت زندہ نہیں تھیں۔

---

[۱۳] وقایع بابر، ص۶

[۱۴] تاریخ رشیدی، ص۳۷۰

[۱۵] تاریخ رشیدی، ص۳۷۰

عصر حاضر میں اسلامی احیاء کے لئے فکری اور علمی اقدامات

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

عالم اسلام کا بحران گیارہویں صدی میں صلیبی جنگوں سے شروع ہوا۔ اس وقت تک ان ممالک میں، جن کو پہلے "اسلامی مشرق" کہا جاتا تھا اور اب "مشرق وسطیٰ" کہا جاتا ہے، مسلمان اکثریت حاصل کر چکے تھے یعنی افغانستان، ماوراء النہر، وسطیٰ ایشیا، ایران، شام، فلسطین، جزیرہ عرب، یمن، خلیج فارس وغیرہ کے علاقوں میں مسلمانوں کی اس وقت اکثریت ہو چکی تھی۔ یہ جنونی جنگیں گیارہویں صدی سے لیکر چودھویں صدی عیسوی (۱۰۹۹۔۱۳۶۹ء) تک چلیں۔ ان کی آڑ میں پورا یورپ عالم اسلام کے مرکزی علاقوں پر پل پڑا۔ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی قبر کو "کافروں" سے بچانے کے نام پر پورے یورپ نے عالم اسلام کے مرکزی علاقوں پر مذہبی نعرے لگاتے ہوئے دھاوا بول دیا حالانکہ ان کا اصل مقصد مزید زمینوں پر قبضہ کرنا تھا (جسے Lebensraum کا نام دیا جاتا ہے) کیونکہ امراء کے لئے یورپ میں زمین کم پڑ رہی تھی۔ ان جنونی حملوں کے دوران ترکی سے لیکر مغرب (مراکش) تک کو تاراج کیا گیا جبکہ سب سے زیادہ نقصان فلسطین، شام اور مصر کو ہوا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے معرکہ حطین (جولائی ۱۱۸۷ء) میں صلیبیوں کی کمر توڑ دی لیکن یہ بے معنی جنگیں شاہ قبرص پیٹر کی سنہ ۱۳۶۹ء میں موت تک جاری رہیں[۱]۔ اسی دوران مسلمانوں کی کمزوری دیکھ کر تیرہویں صدی عیسوی میں مشرق سے منگولوں اور تاتاریوں نے عالم اسلام پر حملے شروع کر دیے۔ جہاں جہاں صلیبی، منگول اور تاتاری گئے وہاں وہاں نہ صرف بے شمار لوگوں کا خون بہایا گیا بلکہ مسلمانوں کے سیاسی اور تجارتی اداروں کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا۔ تاتاری یلغار کو مملوکی قائد سیف الدین قطز نے عین جالوت میں ۳؍ ستمبر ۱۲۶۰ء کو شکست دے کر ناکام بنایا۔

جب صلیبی جنون دھیرے دھیرے ٹھنڈا پڑا تو پرتگال اور اسپین نے مسلم ممالک پر سامراجی قبضے کی مہم چلائی اور مسلم ممالک کے ارد گرد بحری راستوں پر قبضہ کر کے مسلم تجارت کو تہ وبالا کر دیا جو اٹلی میں بندقیہ (وینیس) سے لے کر چین کے کینٹن تک پھیلی ہوئی تھی اور جس پر عالم اسلام کی اقتصادی خوش حالی کا بڑی حد تک انحصار تھا۔ پھر جلد ہی دوسری یوروپین اقوام جیسے انگریز، فرانسیسی، ولندیزی، اطالوی اور بلجیئن وغیرہ قوموں نے مسلم ممالک کے مختلف حصوں پر قبضے شروع کر دیے۔ یہ سلسلہ بیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔

بالواسطہ سامراج کے ختم ہونے کی وجہ تسلط کی سوچ کا خاتمہ نہیں تھا بلکہ پہلی اور دوسری جنگوں

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب: تاریخ فلسطین القدیم، دار النفائس، بیروت، ۱۹۷۳ء، ص: ۱۶۵۔۱۹۰

کے نتیجے میں یوروپین طاقتیں بہت کمزور ہو گئی تھیں اور ایک نئی طاقت–امریکا–ان کی جگہ لے رہی تھی۔ اس نئی طاقت کو مسلم ممالک پر براہ راست سامراجی قبضے کی زیادہ فکر نہیں تھی بلکہ وہ وہاں کے بازاروں اور حکومتوں پر قبضہ چاہتی تھی۔ مزید برآں ان ممالک کے خام مال کو کم سے کم دام پر خریدنا اس کا بنیادی مطمح نظر تھا۔ عالم اسلام کے زوال کا یہ سلسلہ تقریباً ایک ہزار سال سے جاری ہے اور اب بھی تھما نہیں ہے۔ اس کا اثر علمی، ثقافتی اور تہذیبی زندگی کے ہر گوشے پر پڑا۔ پرانے مدارس بند ہوئے، علمی کام کے لئے علماء کی مدد وہمت افزائی کم سے کم تر ہوتی چلی گئی اور ہر میدان میں مغرب کی نقالی کا بول بالا ہو گیا۔ دیندار حلقوں میں اصل اسلامی علوم (علوم قرآن وحدیث وغیرہ) کے بجائے فقہ اور جامد تقلید نے لے لی جس کی وجہ سے مسلمانوں میں مسلکی تعصب اور گروہ بندی کا بول بالا ہوا جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور امت واحدہ آج ۷۲ فرقوں میں بٹ چکی ہے۔ ان حالات میں ابن رشد (م:۱۱۹۸ء) کے بعد عالم اسلام میں کوئی بڑا اجتہادی شان رکھنے والا عالم نہیں پیدا ہوا بلکہ فقہی نصوص حفظ کرنے والے "عالم" کہلائے۔

اس صورت حال کا اثر صرف خواص پر ہی نہیں بلکہ عوام پر بھی پڑا۔ ان کے سامنے کوئی رول ماڈل نہیں رہ گیا۔ علم کے لئے پیاس ختم ہوئی اور دولت ودنیاوی جاہ کے لئے ہوڑ لگ گئی۔ علماء کا احترام ختم ہوا، نئے حاکم اپنے ملک اور عوام سے طاقت حاصل کرنے کے بجائے غیر ملکی حکمرانوں سے طاقت حاصل کرنے لگے بلکہ انہوں نے اپنے ملکوں میں غیر ملکی طاقتوں کو فوجی اڈے تک بنانے کی اجازت دے دی۔ غیر ملکی طاقتوں کی شہ سے بہت سے مسلم ممالک میں فوجی انقلابات برپا ہوئے جس نے معاشرے کی سیاسی اور اخلاقی صورت حال کو اور بھی تہ وبالا کیا اور ہر سطح پر ڈکٹیٹر شپ کو قابل قبول بنایا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ مسلم ممالک کے حکمرانوں سے کوئی امید نہیں ہے کہ وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ، عوام کی دینی اور اسلامی تربیت اور علم کے فروغ کی طرف متوجہ ہوں گے۔ ہر مسلم ملک میں ڈکٹیٹر شپ کا دور دورہ ہے جہاں حاکم کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں ہو سکتا ہے۔ تقریباً ساری حکومتیں مغربی طاقتوں کے بل پر قائم ہیں۔ بعض ممالک میں آسانی سے آنے والی دولت نے بھی حکام اور عوام دونوں کا مزاج بگاڑ دیا ہے۔ اب محنت کرنے کی عادت ختم ہو گئی ہے۔ آفس، دکان اور گھر ہر جگہ غیر ملکی نوکروں، خادموں اور خادماؤں نے کام سنبھال لیا ہے۔ اس سے نہ صرف اخلاقی بگاڑ آیا ہے بلکہ عربی زبان پر بھی نئی نسل کا عبور کم ہو رہا ہے۔

اس اثناء میں، بالخصوص سامراج کے آنے کی وجہ سے، مسلمان غیر مسلم ممالک میں پڑھنے اور کام کرنے جانے لگے اور ان میں سے بہت سوں نے وہاں بسنا بھی شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں دنیا کے تقریباً ہر غیر مسلم ملک میں مسلمانوں کی اقلیتیں وجود میں آ گئیں۔ کہیں کہیں، جیسے جرمنی، فرانس، برطانیہ اور امریکہ میں، مسلمانوں کی معتدبہ تعداد آباد ہو گئی ہے اور اب اس کا کوئی امکان نہیں

ہے کہ یہ لوگ اپنے اصل ملکوں کو کبھی واپس جائیں گے۔ ان زمینی حقائق کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو مسلم اکثریتی ممالک سے زیادہ غیر مسلم ممالک میں لکھنے، پڑھنے، بولنے اور چھاپنے کی آزادیاں حاصل ہیں اور وہاں ان کے جان ومال بھی زیادہ محفوظ ہیں۔ اس کی وجہ سے آج مسلم اقلیتیں ایک غیر معمولی رول ادا کرنے کے لائق ہوگئی ہیں۔ آج مسلم اقلیتوں کے لئے ممکن ہے، اور یہ ان کی ذمے داری بھی ہے، کہ وہ اپنی نئی آبادیوں میں ملی ہوئی آزادیوں کو استعمال کر کے نہ صرف اپنی زندگیوں میں اسلام پر عمل پیرا ہوں بلکہ اسلام کا وہ عملی ماڈل بھی پیش کریں جس کے بغیر اسلام محض ایک نظریہ رہتا ہے۔ غیر مسلم ممالک کی آزادیاں وہاں کے مسلمانوں کو یہ سب کرنے دیں گی مثلاً وہ ایسا تعلیمی، اقتصادی اور اخلاقی اور عملی ماڈل پیش کریں جس سے دنیا صحیح معنوں میں اسلام کی حقیقت سمجھ سکے۔

فروری ۱۹۷۶ میں طرابلس (لیبیا) میں مسلم عیسائی ڈائیلاگ منعقد ہوا تھا۔ اس میں میرے والد (مولانا وحید الدین خاں) بھی بلائے گئے تھے۔ اس ڈائیلاگ میں آسٹرین نو مسلم محمد اسد بھی موجود تھے۔ میں اس وقت لیبیا کی وزارت خارجہ میں کام کرتا تھا۔ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے چند لوگوں کو اپنے گھر پر مدعو کیا تا کہ مسلمانوں اور عالم اسلام کے مسائل کے بارے میں بات ہو۔ محمد اسد اور والد صاحب کے علاوہ اس میں معروف مصری عالم اور قاہرہ یونیورسٹی میں میرے استاد ڈاکٹر عبد الصبور شاہین اور لیبی مفکر محمد سلیمان القائد وغیرہ موجود تھے۔ اس گفتگو کے دوران یہ سوال آیا کہ کس طرح اسلام نظام عالم کی تشکیل کر سکتا ہے؟ سب نے کچھ نہ کچھ رائے دی۔ محمد اسد کی رائے تھی کہ جب تک ہم اسلام کا کوئی ورکنگ ماڈل دنیا کے سامنے نہیں پیش کریں گے، کوئی ہماری بات کو سنجیدگی سے نہیں لے گا۔ یہ بات میرے دل میں گھر کر گئی۔ تب سے میں نے اس بات کو متعدد بار اپنی تحریروں اور تقریروں میں دہرایا ہے۔ میں اس تجزیہ سے پوری طرح متفق ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ آج کی معاصر دنیا میں ہم کسی بھی میدان میں اسلام کا ورکنگ ماڈل نہیں پیش کر پائے ہیں، چاہے وہ سیاسی نظام کا ہو یا سماجی، معاشی نظام، تعلیمی و سائنسی نظاموں کا۔ ہر میدان میں ہم دوسروں سے پیچھے ہیں اور دوسروں کی محض نقالی کر رہے ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا اسلام کی حقانیت کو تسلیم کرے اور اسلام ایک عالمی طاقت بنے تو ہمیں اسلام کا ایک عملی ماڈل پیش کرنا ہوگا۔ ہمیں عملی طور پر دکھانا ہوگا کہ اسلام جب کسی سوسائٹی پر حاکم ہوتا ہے تو وہاں ایسا ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ اسلام کے نام پر آج ۵۸ حکومتوں کے پائے جانے کے باوجود آج تک مسلمان اسلام کا کسی بھی میدان میں ماڈل نہیں پیش کر پائے ہیں۔ یہ ایسا خلا ہے جسے آج بھی پر کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم ایک اسلامی ورکنگ ماڈل نہ پیش کر لیں گے ہمیں اسلام کے بارے میں بڑے بڑے دعوے کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ہمارے دعوؤں کو سنجیدگی سے لے گا۔

بیمارستان-اسلامی معاشرہ کا قابل فخر حصہ

ڈاکٹر نجم السحر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

nsahar@jamiahamdard.ac.in

ڈاکٹر محمد اسامہ

گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

musama1@jmi.ac.in

اسلام کا ایک اہم اور بنیادی پیغام فلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ انسانیت بھی ہے، اسی لیے وہ اپنے متبعین سے امن و سلامتی، ایثار و ہمدردی، غم خواری، انفاق فی سبیل اللہ اور خدمت خلق کا مطالبہ کرتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا جائزہ لیا جائے تو اس کا ایک چوتھائی حصہ عقائد و عبادات کا ہے، جب کہ تین چوتھائی حصہ معاملات پر مشتمل ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات جیسے البقرۃ:۲۱۹، آل عمران:۹۲، الملک: ۲ اور الحج:۷۷ وغیرہ میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو خدمت خلق کی تلقین کی ہے۔ اسی طرح احادیث میں بھی خدمت خلق کے تصورات کو واضح کیا گیا ہے، جیسے فرمان نبوی "وخیرالناس أنفعهم للناس [1]" کے مِصداق اچھے افراد وہی ہیں جو دوسروں کی خیر خواہی اور بھلائی چاہتے ہیں۔

قرآن وحدیث کی ان تعلیمات کا سب سے بہتر نمونہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی اور مدنی زندگی میں نظر آتا ہے۔ آپؐ نے سرزمین عرب میں پہلی بار جائداد یا اس کے منافع کو وقف کرنے کا طریقہ رائج کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۲) نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" میں لکھا ہے کہ عربوں میں اسلام سے قبل وقف کا رواج نہیں تھا[2]۔ آپؐ نے مسلمانوں کے لیے مسجد نبوی کی زمین

---

[1] الطبرانی، سلیمان بن أحمد، المعجم الأوسط، دارالحرمین، للطباعة والنشر والتوزیع، القاهرة ، ۱۹۹۵، الجزء السادس، رقم الحدیث:۵۷۸۷، ص۵۸

[2] أحمد بن عبد الرحیم (دہلوی، شاہ ولی اللہ)، حجۃ اللہ البالغۃ، دار ابن کثیر، للطباعة والنشر والتوزیع، دمشق، ۲۰۱۰، المجلد الثانی، باب ۴، التبرع والتعاون، ص ۳۶۴

وقف کرتے ہوئے اس سلسلے کا آغاز کیا، نیز آپؐ کے ذریعے قائم کردہ بیت المال اور اوقاف کے نظام کے علاوہ بعض دیگر روایات نے مسلمانوں میں خدمت خلق کے تصورات کو واضح کیا، ان ہی تصورات کی بنیاد پر صحابہ کرام، خلفاء راشدین، اموی اور عباسی خلفاء کے علاوہ دیگر متعدد مسلم حکم رانوں نے عالم اسلام میں گراں قدر اور نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ مسلمانوں نے بہ حیثیت مجموعی اپنی اراضی، باغات، مکانات اور پیداوار وغیرہ کو انفرادی یا اجتماعی سطح پر رفاہ عامہ کے لیے وقف کیا اور اس سے معاشرے نے بلا تفریق مذہب وملت فائدہ اٹھایا۔

رفاہ عامہ کے ادارے بنیادی طور پر دو طرح کے تھے: اول وہ ادارے جن کو مختلف زمانوں کی مسلم حکومتوں نے قائم کیا تھا۔ دوم وہ تمام ادارے جنھیں امراء، وزراء، سپہ سالاروں، مالداروں اور دیگر اصحاب ثروت نے انفرادی طور پر ذاتی دل چسپی سے قائم کیا تھا۔ ان اداروں میں مساجد کا تذکرہ سرفہرست ہے، جن کی تعمیر میں ہر دور کے مسلم سلاطین، امراء، وزراء اور اصحاب حیثیت کے علاوہ عام مسلمان بھی اپنی بساط بھر حصہ لیتے تھے۔ دوسرے اہم اداروں میں مدارس، تکیے اور زاویے وغیرہ تھے، جہاں طلبہ مختلف علوم حاصل کرتے تھے اور دنیاوی الجھنوں اور مسائل سے دور اللہ تعالیٰ کی عبادت وریاضت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ اسی طرح سرائے، طعام خانے یا لنگر وغیرہ بھی خدمت خلق کے اہم ادارے تھے، جن میں مسافروں، غریبوں، مسکینوں اور حاجت مندوں کی بنیادی ضروریات پوری کی جاتی تھیں۔ بعض اوقاف ایسے بھی تھے جن کی آمدنی سے راستوں، پلوں، سڑکوں کی حفاظت اور تعمیر ودرستی کے کام کیے جاتے تھے، نیز ان سے تالابوں، باؤلیوں، کنوؤں اور نہروں وغیرہ کا بھی انتظام کیا جاتا تھا، تاکہ مسافروں، کسانوں اور جانوروں وغیرہ کو پانی کی کمی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ متعدد ایسے ادارے بھی تھے جن میں اندھوں، اپاہجوں معذوروں وغیرہ کی دیکھ بھال کی جاتی تھی اور ان میں لاوارث بچوں، یتیموں اور مسکینوں وغیرہ کی غذا، لباس، تعلیم اور شادی وغیرہ کا بھی انتظام ہوتا تھا۔

مسلم دور حکومت میں خدمت خلق کے بعض ایسے بھی ادارے تھے جن میں ماؤں کو ان کے چھوٹے بچوں کے لیے دودھ اور شکر وغیرہ کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اس حوالے سے سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا نام قابل ذکر ہے۔ قیدیوں کی دیکھ بھال، ان کی صحت وغیرہ کا خیال رکھنے کے علاوہ ان کی اصلاح کے لیے بھی متعدد ادارے قائم کیے گئے تھے۔ انسانوں کے علاوہ جانوروں کے علاج اور ان کے لیے چراگاہوں کے انتظام وانصرام کے لیے بھی ادارے قائم تھے۔ رفاہ عامہ کے اہم اداروں میں

ایک ادارہ بیمارستان / مارستان[۳] (شفاخانوں) کا قیام ہے، چوں کہ کتابوں میں اسپتال کے لیے لفظ بیمارستان استعمال کیا گیا ہے، اس لیے مقالے میں بھی یہی لفظ لکھا جارہا ہے۔

علم طب اور مسلمان : اسلام انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں رہ نمائی کرتا ہے، چنانچہ اسلامی تعلیمات میں حفظان صحت، تن درستی اور علاج کے لیے متعدد ہدایات موجود ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''بے شک تم پر تمہارے جسم کا حق ہے۔''[۴] ایک اور جگہ آپؐ نے فرمایا: ''ایک مضبوط مومن کم زور مومن سے بہتر اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے۔''[۵] ظاہر ہے کہ انسان اپنی صحت کا خیال تب رکھے گا جب اسے اس کا علم ہوگا، اسی لیے آپؐ نے لوگوں کو طب کی تعلیم حاصل کرنے اور علاج کرانے کی ترغیب فرمائی: ''اے اللہ کے بندو! علاج کرو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کی دوا پیدا فرمائی ہے، سوائے بڑھاپے کے۔''[۶]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات کے پیش نظر مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں دیگر علوم وفنون کی طرح علم طب پر توجہ دی اور اس فن میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ در حقیقت اہل عرب اسلام سے پہلے بھی علم طب، بیماریوں کے اسباب، علامات اور علاج معالجہ کے ابتدائی مراحل سے واقف تھے، اس لیے کہ ان میں سے بعض نے ایران یا اپنے ہمسایہ ملکوں میں جاکر طب کا کچھ نہ کچھ علم سیکھا تھا، جیسے جندی شاپور[۷] (Jundishapur) کے مشہور ''مدرسہ جندی شاپور''

---

[۳] بیمارَستان یا بیمارِستان دراصل فارسی لفظ ہے اور یہ دو لفظوں کا مرکب ہے۔ ''بیمار'' یعنی مریض اور ''ستان'' مطلب گھر یا مکان اور بیمارستان بہ معنی بیماروں کا گھر، پھر وقت کے ساتھ ساتھ اسے مختصر کرکے ''مارستان'' کردیا گیا، جیسا کہ اسماعیل بن حماد الجوهری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے: الجوهری، اسماعیل بن حماد، الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية، دارالعلم للملايين، بيروت، الطبعة الثانية، ۱۹۷۹، ص۹۷۸۔ عربی زبان میں اب اسپتال کے لیے مستشفیٰ کا لفظ مستعمل ہے اور بیمارستان / مارستان کا اطلاق پاگل خانے پر کیا جاتا ہے۔

[۴] البخاری، محمد بن اسمٰعیل، صحیح البخاری، دارابن کثیر، للطباعة والنشر والتوزیع، دمشق، ۲۰۰۲، الطبعة الأولیٰ، کتاب النکاح، باب لزوجک علیک حق، رقم الحدیث: ۵۱۹۹، ص۱۳۲۶

[۵] النیسابوری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، بیت الأفکار الدولیة، للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۹۹۸، کتاب القدر، رقم الحدیث: ۲۶۶۴، ص۱۰۶۹

[۶] السجستانی، سلیمان بن الاشعث، سنن أبی داؤد، دارالفکر للطباعة والنشروالتوزیع، بیروت، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۵، کتاب الطب، رقم الحدیث: ۳۸۵۵، ص۷۲۰

[۷] فارس (ایران) کے صوبے خوزستان (Khuzistan) کا ایک مشہور شہر ہے، اسے ساسانی سلطنت

[۸]اور مدرسہ اسکندریہ، مصر(Alexandrian school) سے بعض عرب مستفید ہوئے تھے۔ اس دور کے نام ور اطباء جن میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں، ان میں الحارث بن کلدۃ الثقفی[۹]، النضر بن الحارث الثقفی[۱۰]، ابن ابی رمثۃ التیمی[۱۱]، عبدالملک بن أبجر الکنانی[۱۲]، زینب طبیبۃ بنی أود[۱۳]،

(Sasanian Empire 224-651CE)کے حکم راں شاہ پور اول(Shahpur I/Shabuhr I- 240-270)نے ۲۶۰ میں تعمیر کرایا تھا)

[۸]عربی طب کے ارتقاء میں مدرسہ طبیہ جندی شاہ پور کا اہم کردار ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایرانی اثرات کی وجہ سے عربوں نے شفاخانوں کے لیے لفظ بیمارستان کا لفظ استعمال کیا تھا، البتہ محققین کے درمیان مدرسہ جندی شاہ پور کی تعمیر کے حوالے سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک طبقہ کا ماننا ہے کہ اس کی تعمیر ۲۶۰ میں شہر کی تعمیر کے ساتھ ہی ہو گئی تھی اور دوسرے طبقہ کا ماننا ہے کہ اسے شاہ پور دوم(Shahpur II- 309-379)نے اپنے دور میں قائم کیا تھا۔ تفصیل کے لیے "Mehmet Mahfuz Söylemez" کا مضمون " The Jundishapur School: Its History,Structure, and Functions"ملاحظہ ہو، اس کا لنک یہ ہے: https://www.ajis.org/index.php/-ajiss/article/view/455/2246

[۹] حارث بن کلدۃ (المعروف بہ "طبیب العرب")کا تعلق بنی ثقیف سے تھا۔ وہ طائف کے رہنے والے تھے اور مدرسہ طبیہ جندی شاپور سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انہوں نے اپنی عمر کے آخری حصے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور بعض روایتوں کے مطابق اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔ آپؐ نے متعدد صحابہ کرام جیسے حضرت سعدؓ وغیرہ کو ان سے علاج کرانے کا مشورہ دیا تھا۔

[۱۰] ان کے والد الحارث بن کلدۃ تھے اور انہوں نے بھی اپنے والد کی طرح مدرسہ طبیہ جندی شاپور سے تعلیم حاصل کی تھی۔ علم کے حصول کے لیے متعدد ممالک کا سفر کیا۔ قدیم علوم اور فلسفہ یہودی اور عیسائی علماء سے سیکھے اور طب کی تعلیم اپنے والد سے سیکھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتداء سے مخالف تھا اور حضرت علیؓ کے ذریعے غزوہ بدر میں قتل کر دیا گیا۔

[۱۱] دور جاہلی کے مشہور اور تجربہ کار سرجن تھے۔ عہد نبوی تک حیات رہے اور بقول جمال الدین قفطی انہوں نے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کی تھی۔ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ انہوں نے آپؐ کے کندھے پر نبوت کی مہر دیکھی تو اسے مرض سمجھ کر آپؐ سے علاج کرنے کے لیے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ تم تو رفیق ہو، طبیب اللہ تعالیٰ ہے۔

[۱۲]عہد اموی کے مشہور نصرانی طبیب، کیمیاں داں اور فلسفی تھے۔ انہوں نے اسکندریہ سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور پھر وہ وہیں کچھ وقت تک درس و تدریس کی خدمت انجام دینے کے بعد عرب واپس آ گئے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے ان کے گہرے تعلقات تھے اور ان کے طبیب خاص تھے۔ بقول غلام جیلانی انہوں نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے ہاتھوں اسلام قبول کر لیا تھا۔

[۱۳] عہد جاہلی کی مشہور ماہر امراض چشم اور سرجن تھیں اور ان ہی صفات کی وجہ سے عربوں میں معروف و مقبول

الشمردل بن قباب الکعبی النجرانی[۱۴]، ضماد بن ثعلبۃ الأزدی[۱۵]، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ[۱۶]، حضرت شفاء بنت عبد اللہ، حضرت رفیدہ بنت سعد[۱۷]، حضرت ام عطیہ الانصاری[۱۸]، اور اُم الحسن بنت القاضی اَحمد بن عبد اللہ الطنجالی[۱۹] وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے، ان میں سے متعدد اطباء ایسے بھی رہیں جو عہد نبوی، عہد خلفائے راشدین اور عہد اموی تک زندہ رہے اور اس میدان میں اپنی خدمات انجام دیں۔ عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین میں میری معلومات کی حد تک باقاعدہ کسی بیمارستان کا تذکرہ نہیں ملتا ہے، البتہ عہد نبوی میں مسجد نبوی میں زخمیوں کے علاج کے لیے ضرور ایک خیمہ لگایا گیا تھا، جس میں حضرت رفیدہ بنت سعدؓ جنگوں میں زخمی ہونے والوں کا علاج کیا کرتی تھیں۔ اسی طرح جنگوں میں مسلمانوں کی فوج کے ساتھ متعدد نام ور اطباء اور جراح وغیرہ بھی ہوا کرتے تھے۔ کہا جاسکتا ہے عربوں کو علم طب کی واقفیت عہد جاہلی، عہد نبوی اور عہد خلفاء راشدین وغیرہ میں یقیناً غیر معمولی حد تک تھی۔

تھیں۔

(۱۴) شمردل (مشہور کاہن) نجرانی وفد بنی حارث بن کعب کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور طب کے حوالے سے بعض سوالات کیے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ کسی کا علاج اس وقت تک نہ کرو، جب تک کہ تمہیں اس کی دوا نہ معلوم ہو۔ اس نے اعتراف کیا کہ آپؐ مجھ سے زیادہ طب کا علم رکھتے ہیں۔

(۱۵) ضماد کا تعلق عرب کے ایک قبیلے أزد شنوۃ سے تھا۔ انہوں نے مشرکین مکہ کے کہنے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوا کے ذریعہ علاج کرنا چاہا، لیکن انہوں نے جب آپؐ سے کلمہ اور بعض دیگر باتیں سنیں تو اسلام قبول کر لیا۔

(۱۶) حضرت عائشہؓ کے علم طب سے ان کے بھانجے حضرت عروہ بن زبیرؓ بھی حیرت زدہ تھے اور انہوں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے کہاں سے یہ علم سیکھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی عمر کے آخری حصے میں بیمار ہوئے تو آپؐ کے پاس عرب کے مختلف وفود آئے اور انہوں نے آپؐ کے لیے مختلف علاج متعین کیے، میں نے ان کی رہ نمائی میں علاج کیا اور سیکھا بھی۔ الذھبی، شمس الدین محمد، سیر أعلام النبلاء، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۹۸۲ء الجزء الثانی، ص ۱۸۲

(۱۷) رفیدہ بنت سعدؓ عورتوں کے امراض کی ماہر تھیں۔ ان کا خیمہ مسجد نبوی میں تھا، جس میں وہ زخمیوں کا علاج کیا کرتی تھیں۔

(۱۸) ام عطیہؓ سات غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہیں، وہ کھانا بناتیں، مریضوں اور زخمیوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔

(۱۹) اُم الحسن بنت القاضی اَحمد کا تعلق اندلس کے ایک شہر "لوشۃ" سے تھا اور طب کی ماہر تھیں۔ ان کا طب کے ماہرین سے مختلف موضوعات پر مباحثہ ہوتا رہتا تھا۔

اسلامی تاریخ کا پہلا بیمارستان: عہد اموی میں علم طب کو مزید ترقی ملی اور اس فن سے متعلق متعدد یونانی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا۔ اس دور کی خاص بات یہ رہی کہ ولید بن عبدالملک (۶۷۴-۷۱۵) کے ذریعے مسلمانوں کا پہلا باقاعدہ بیمارستان دمشق میں ۷۰۷ عیسوی میں تعمیر کیا گیا، جو نابیناؤں، جذام[۲۰] کے مریضوں اور بعض دیگر معذوروں کے لیے مخصوص تھا۔ اس میں ماہر اور تجربہ کار طبیبوں اور جراحوں کو متعین کیا گیا اور ان کے لیے بڑی بڑی جاگیریں اور تنخواہیں مقرر کی گئیں۔ اسی طرح اندھوں اور جذام کے مریضوں کے لیے بھی وظائف مقرر تھے، کیوں کہ انہیں بیمارستانوں سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے بعد اسلامی مملکت کے مختلف حصوں مثلاً دمشق، بغداد، قاہرہ، بخارا، خراسان، موصل، حلب، اسکندریہ، قرطبہ اور اشبیلیہ وغیرہ میں خلفاء، حکم راں، سلاطین، امراء، وزراء اور دیگر اہل خیر حضرات نے انسانی خدمت اور صدقہ جاریہ کے طور پر متعدد بیمارستان قائم کیے۔ ان میں نہ صرف مریضوں کا علاج کیا جاتا تھا، بلکہ یہ اپنے وقت کے میڈیکل کالج بھی تھے، ان سے پڑھ کر نکلنے والوں میں ڈاکٹروں، سرجنوں اور ماہرین امراضِ مخصوصہ کی ایک بڑی تعداد ہوا کرتی تھی۔ اس حوالے سے میکس میئرہوف نے اپنے مقالے میں لکھا ہے:

> اسلامی سائنس کے اس سنہری دور (۹۰۰-۱۱۰۰) میں ہم سائنسی اداروں پر نظر ڈال سکتے ہیں۔ اسپتال ابتداء میں ہی قائم کر دیے گئے تھے اور غالباً انہیں جندی شاہ پور کے قدیم اور مشہور مدرسہ اور اسپتال کے طرز پر بنایا گیا تھا۔ اسلامی دنیا میں اسی سے اسپتال کے لیے بیمارستان کی اصلاح اخذ کی گئی ہے۔ ہمارے پاس کم از کم چونتیس (۳۴) ایسے اداروں کے حوالے سے مستند معلومات ہیں، جو فارس (ایران) سے مراکش تک اور شمالی شام سے مصر تک پھیلے ہوئے ہیں۔[۲۱]

---

[۲۰] طب میں ترقی کے ساتھ ساتھ کوڑھیوں کو "جذمی" (Jadhma) کے بجائے "مرضیٰ" (Marda) کا نام دیا گیا، تاکہ انہیں سبکی نہ محسوس ہو اور عام طور پر انہیں شہر سے دور الگ بستی میں آباد کرایا جاتا تھا، جیسے قرطبہ میں ان کا ایک محلہ ہی "ربض المرضیٰ" (Rabd al-Marda) (بیماروں کی بستی) کے نام سے معروف تھا۔ ان کی بستی کو "الحارۃ" (Al-Hara) بھی کہا جاتا تھا اور کم و بیش تمام مسلم شہروں میں "الحارۃ" کا قیام تھا، نیز انہیں حسب ضرورت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا تھا۔
N. Sehsuvaroglu, Bedi, "Bimaristan", *The Encyclopaedia of Islam*, 1986, Edited by: H. A. R Gibb *et al*., E. J. Brill, Leiden, Volume. I, pp. 1223-1225.

[۲۱] Meyerhof, Max, "Science and Medicine," in Sir Thomas Arnold & Alfred Guillaume (eds.), *The Legacy of Islam*, Oxford University Press, London, 1931, pp. 335-336

بیمارستانوں کی قسمیں: اسلامی تاریخ کے متعدد ادوار میں مسلمانوں کے ذریعے تین قسم کے بیمارستان قائم کیے گئے تھے:

تعمیر شدہ بیمارستان: اس طرح کے بیمارستان ملک کے تمام صوبوں اور چھوٹے بڑے شہروں میں تھے، ان میں سے بعض بیمارستانوں کو امراء، وزراء، حکام اور قائدین وغیرہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا، نیز ان میں موجود اطباء کو "شاہی طبیب" یا "خصوصی طبیب" کہا جاتا تھا۔ اسی طرح عام بیمارستان بھی تھے، جن میں عوام کا علاج معالجہ کیا جاتا تھا۔ بعض بیمارستان صرف فوجیوں کے لیے مخصوص تھے اور ان کے لیے طبیب بھی مخصوص ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح قیدیوں کے لیے بھی الگ سے بیمارستان ہوا کرتے تھے، ان میں نہ صرف ان کا روزانہ معائنہ ہوا کرتا تھا، بلکہ حسبِ ضرورت علاج معالجہ بھی کیا جاتا تھا۔ قیدیوں کو مہیا کی گئیں سہولیات کا اندازہ وزیر علی بن عیسیٰ بن الجراح (۸۵۹-۹۴۶) کی طرف سے أبوسعید سنان بن ثابت بن قرۃ (۸۸۰-۹۴۳)، رئیس الاطباء بغداد کو لکھی گئی درج ذیل تحریر سے ہوتا ہے:

> مجھے قیدیوں کے متعلق بے حد فکر ہے۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ ان کی کثرت اور قید خانوں کی حالت گواہ ہے کہ ان میں بے شمار مریض ہوں گے اور وہ روک دیے گئے ہیں کہ وہ اپنے فائدے کے لیے کچھ سوچ سکیں۔ انہیں ڈاکٹروں سے بھی ملنے سے روک دیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیماریوں کے سلسلے میں ان سے مشورہ کر سکیں، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے علاحدہ اطباء مقرر کیے جائیں، جو ہر روز ان کا معائنہ کریں اور انہیں دوائیں اور مشروبات پلائیں، نیز وہ تمام قید خانوں میں جائیں اور وہاں مریضوں کا علاج کریں۔ وہ ان کی بیماریوں کو دور کریں، ان دواؤں اور مشروبات سے جن کی انہیں ضرورت ہو، اور "المزورات" (ایک طرح کا کھانا جسے بنا گوشت کے مریضوں کے لیے بنایا جاتا ہے) پیش کیا جائے جن مریضوں کو ان کی ضرورت ہو۔[۲۲]

گشتی بیمارستان (Mobile Hospital): یہ وہ بیمارستان تھے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ حسب ضرورت منتقل ہوتے رہتے تھے، جہاں پر قائم شدہ بیمارستان ابھی موجود نہیں تھے، انہیں خزانۃ للأدویۃ والاشربۃ یعنی گشتی یا سفری شفاخانہ کہا جاتا تھا۔ اس کے اولین نقوش ہمیں عہد نبوی میں غزوہ خندق کے موقع پر نظر آتے ہیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زخمیوں کے لیے ایک

---

[۲۲] الخزرجی، موفق الدین أبی العباس أحمد بن القاسم، (المعروف بہ ابن أبی اصیبعہ)، عیون الأنباء فی طبقات الأطباء، دار مکتبۃ الحیاۃ، بیروت، بدون سنۃ، ص ۳۰۱

علاحدہ عارضی خیمہ قائم کرایا تھا اور اس میں متعدد صحابہ کرام جیسے حضرت سعد بن معاذؓ وغیرہ کا علاج کیا گیا تھا۔ متعدد مورخین نے اسے مسلمانوں کا پہلا گشتی جنگی بیمارستان قرار دیا ہے۔ اس کے بعد حکم رانوں نے گشتی بیمارستانوں کو ترقی دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں باقاعدہ گشتی بیمارستانوں کا آغاز ہو چکا تھا، کیوں کہ اس حوالے سے وزیر علی بن عیسیٰ بن الجراح نے رئیس الاطباء بغداد، بوسعید سنان بن ثابت بن قرۃ کو لکھا تھا:

> میں نے اہل سواد (عراق کا نچلا حصہ) کے لیے غور وفکر کیا ہے کہ ان میں بیمار لازماً ہوں گے، لیکن ان کے لیے جعلی اطباء ہوں گے، کیوں کہ ان بستیوں میں کوئی باقاعدہ طبیب موجود نہیں ہے۔ آپ جلد از جلد اطباء کا ایک گروہ تیار کریں اور ان کے لیے دواؤں اور مشروبات کا ایک وافر ذخیرہ فراہم کریں۔ یہ اطباء ان گاؤں میں جائیں اور جہاں جس قدر ٹھہرنے کی ضرورت ہو رکیں اور مریضوں کے علاج کے بعد دوسرے گاؤں میں منتقل ہو جائیں، تاکہ ان تمام گاؤں میں جہاں ابھی تک بیمارستان تعمیر نہیں کیے جاسکے ہیں، علاج معالجہ کی سہولیات فراہم کرائی جاسکے۔[۲۳]

مسلمانوں کے ان اقدام کا نتیجہ تھا کہ ایک صدی کے اندر ہی گشتی بیمارستانوں کا رواج عام ہو چکا تھا۔ اس کی گواہی میکس میئر ہوف نے اپنے مذکورہ مقالے میں دی ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ گیارہویں صدی میں گشتی بیمارستان معروف تھے[۲۴]۔ نیز تاریخ میں آتا ہے کہ سلطان محمود سلجوقی (۱۰۹۴-۱۰۹۲) کے دور میں گشتی بیمارستان اس قدر وسیع ہو گئے تھے کہ ان کا ساز وسامان چالیس اونٹوں پر لادا جاتا تھا۔ ان بیمارستانوں میں وہ تمام سہولتیں فراہم تھیں جن کی ضرورت مریضوں کو ہوتی تھی، یعنی ان کے لیے اطباء، دوائیں، کپڑے، کھانے پینے کا سامان اور بستر وغیرہ سب کچھ موجود ہوتا تھا۔

ابتدائی طبی امداد کے مراکز (First Aid Centres)**:** مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں اسلامی مملکت کے مختلف حصوں میں حسب ضرورت ابتدائی طبی امداد کے مراکز بھی قائم کیے۔ ان مراکز کا قیام بالعموم ان جگہوں پر کیا جاتا تھا جہاں بھیڑ بھاڑ زیادہ ہو، جیسے جامع مسجد، تفریح گاہ، پارک وغیرہ، تاکہ اگر کسی کی اچانک طبیعت خراب ہو جائے تو اسے بروقت طبی امداد مل سکے۔ اس حوالے

---

(۲۳) عیون الانباء فی طبقات الأطباء، دارمکتبۃ الحیاۃ، بیروت، بدون سنۃ، ص۳۰۱

(۲۴) Meyerhof, Max, "Science and Medicine," in Thomas Arnold & Alfred Guillaume (eds.), *The Legacy of Islam*, Oxford University Press, London, 1931, p. 336.

سے تقی الدین مقریزی (۱۳۶۴-۱۴۴۲) نے لکھا ہے:

أحمد بن طولون نے جب مصر میں اپنی مشہور نادر جامع مسجد تعمیر کرائی تو اس کے آخری حصے میں ایک وضوخانہ اور ایک ڈسپنسری قائم کی، جس میں جذام کے علاوہ تمام قسم کی دوائیں موجود ہوا کرتی تھیں۔ جمعہ کے دن ایک ڈاکٹر کی ڈیوٹی لگائی جاتی تھی کہ نمازیوں میں سے کسی کی طبیعت اگر خراب ہو جائے تو اسے فوراً ابتدائی طبی امداد دی جاسکے۔[۲۵]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب اسلامی تاریخ کے بعض مشہور بیمارستانوں کا ذکر کر دیا جائے۔[۲۶] ان میں خلیفہ ہارون رشید (۷۸۶-۸۰۹) کے دور میں بغداد میں قائم کیا گیا بیمارستان[۲۷]، المعتضد (۸۹۲-۹۰۲) کے غلام بدر المعتضدی کے ذریعے دریائے دجلہ کے کنارے المخرم کے علاقے میں قائم کیا گیا بیمارستان، وزیر علی بن عیسیٰ کی جانب سے شہر المنصور کے شمال میں علاقہ الحربیہ میں قائم شدہ بیمارستان، سنان بن ثابت کے ذریعے ۹۱۸ عیسوی میں دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر قائم شدہ "بیمارستان السیدة" (اس کا خرچ چھ سو دینار مہینہ تھا)، نیز اسی سال باب الشام میں "بیمارستان المقتدری" (اس کا خرچ دو سو دینار مہینہ تھا) تعمیر ہوا۔ ایک اہم "بیمارستان ابن الفرات" بھی ہے۔ اسی طرح بغداد ہی میں عضد الدولہ (936-983 AD) کے ذریعے ۹۸۲ عیسوی میں قائم کیا گیا

---

[۲۵] المقریزی، تقی الدین أحمد، المواعظ والاعتبار فی ذکر الخطط والآثار، مؤسسۃ الفرقان للتراث الاسلامی، لندن، ۲۰۰۳، المجلد الرابع، ص ۶۴

[۲۶] بیمارستانوں کی تفصیل N. Sehsuvaroglu, Bedi, "Bimaristan", in *The Encyclopaedia of Islam*, 1986, edited by H.A. R Gibb *et al.*, E. J. Brill, Leiden, and Volume. I, pp. 1223-1226. سے لی گئی ہے اور بعض اہم بیمارستانوں کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے۔

[۲۷] ہارون رشید نے اس کو تعمیر کرنے کی ذمہ داری جندی شاہ پور کے ایک عیسائی طبیب جبرئیل بن بختیشوع (Jibrail bin Bakhtishu) کو دی تھی۔ یہ بیمارستان بغداد کے جنوب مغربی مضافات میں کرخایہ نہر (Karkhaya Canal) کے کنارے واقع تھا۔ اسی موقع پر مدرسہ جندی شاہ پور کے ایک مشہور دواساز کو بھی اس بیمارستان میں لایا گیا اور اس کے بیٹے یوحنا (یحییٰ) بن ماسویہ (Yahya bin Masawayh) کو بعد میں بیمارستان کا سربراہ بنایا گیا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہارون رشید کے وزیر یحییٰ بن خالد برمکی کی درخواست پر منکہ ہندی (Indian Manka) نے سنسکرت کی طبی تصنیف "سسرتا سمہتا" Susruta-Samhita کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابو بکر الرازی (Abu Bakar Al-Razi) نے یہاں متعدد خطاب کیے تھے۔ یحییٰ بن خالد برمکی نے بھی ایک "بیمارستان برامکہ" تعمیر کرایا تھا اور اس کے ساعور ہندوستانی طبیب ابن دِھن تھے۔

"عضدی بیمارستان"[۲۸]، دمشق میں نورالدین زنگی (۱۱۷۵-۱۱۴۶) کے ذریعے ۱۱۵۴ میں قائم کیا گیا "نوری بیمارستان"[۲۹]، مصر میں احمد بن طولون (۸۳۵-۸۸۴) کا ۸۷۲-۸۷۴ میں بنایا ہوا بیمارستان[۳۰]، سلطان صلاح الدین (۱۱۹۳-۱۱۳۷) کا تعمیر کردہ "ناصری بیمارستان"، بحری مملوک سلطان ملک منصور، سیف الدین قلاوؤن (۱۲۹۰-۱۲۲۲) کا قاہرہ میں ۱۲۸۴ میں قائم کردہ "منصوری بیمارستان"[۳۱]، ابویوسف یعقوب المنصور الموحدی (۱۱۸۴-۱۱۹۹) کے ذریعے شمالی افریقہ

---

[۲۸] عضدی بیمارستان (Adudi Bimaristan) کو بغداد کا سب سے شان دار بیمارستان مانا جاتا تھا۔ اس میں چوبیس اطباء تھے، جو مختلف فن کے ماہر تھے۔ اس بیمارستان کے طبیب جبرئیل بن عبداللہ کے کام کرنے کے دن ہفتے میں دو دن اور دو راتیں تھیں اور ان کی تنخواہ تین سو درہم ماہانہ تھی۔ اس میں اطباء طلبہ کے سامنے لیکچرز بھی دیا کرتے تھے۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ ابو بکر الرازی نے اس بیمارستان کی جگہ کا انتخاب اس طرح سے کیا کہ اس نے بغداد کے چاروں کونوں پر گوشت کے ٹکڑے لٹکا دیے تھے اور جس جگہ سب سے کم گوشت خراب ہوا، وہیں اسے تعمیر کیا گیا اور یہ بھی مانا جاتا ہے کہ عضد الدولہ نے الرازی کو ساعور (رئیس الاطباء) کے عہدے کے لیے سو اطباء کے درمیان سے منتخب کیا تھا، لیکن الرازی کی وفات پچاس سال قبل ہی ہوگئی تھی تو اسے اس طرح سے سمجھا جاسکتا ہے کہ بیمارستان عضدی اور بیمارستان معتضدی ایک جیسے نام ہیں اور مؤخر الذکر کا قیام الرازی کی زندگی میں ہوا تھا، تو ممکن ہے کہ یہ تمام باتیں بیمارستان معتضدی سے منسوب ہوں۔

[۲۹] ایسا مانا جاتا ہے کہ اس بیمارستان کی تعمیر ایک نامعلوم انگریز بادشاہ کے زرفدیہ سے کی گئی تھی، بہر حال یہ اپنے زمانے کا بڑا اور مشہور بیمارستان تھا اور بقول ابن جبیر اس میں ملازمین رجسٹروں میں مریضوں کے نام، ان کی دوائیں اور غذاؤں وغیرہ کا روزانہ اندراج کرتے تھے۔ ایک طبیب کا روزانہ کا کام تھا کہ وہ بیمارستان میں داخل مریضوں کی کیفیت پوچھے، دوائیں اور ہدایات تجویز کرے، نجی مریضوں کو بھی دیکھے اور پھر شام میں بیمارستان کے کانفرنس ہال میں تین گھنٹہ طب کے موضوعات پر لیکچر زدے۔

[۳۰] احمد بن طولون کے اس بیمارستان سے پہلے مصر میں کوئی دوسرا بیمارستان نہیں تھا۔ اس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں کسی فوجی یا غلام کا داخلہ بالکل ممنوع تھا، باوجود اس کے کہ اس میں مردوں اور عورتوں کے لیے تمام طرح کی روایتی سہولیات میسر تھیں۔

[۳۱] مصر کا یہ سب سے مشہور اور شان دار بیمارستان تھا۔ اس میں مردوں اور عورتوں دونوں کا داخلہ تھا، کسی کو واپس نہیں کیا جاتا تھا اور علاج کی بھی کوئی مدت مقرر نہیں تھی۔ اس میں ہر مرض کے لیے علاحدہ علاحدہ وارڈ تھے۔ اس میں ایک ادویہ سازی کا شعبہ، اسٹور روم، مرد اور عورت نرس، بڑی تعداد میں دیگر انتظامیہ کے ممبران، عبادت گاہ، لائبریری اور کانفرنس ہال وغیرہ تھے۔ دراصل فاطمیوں کے محل کو ہی منصوری بیمارستان بنایا گیا تھا، اس لیے یہاں تقریباً آٹھ ہزار لوگوں کی بیک وقت گنجائش تھی۔ اس کا خرچ بھی کافی زیادہ تھا، اس لیے منصور نے ایک ملین درہم سالانہ کی ایک بڑی رقم اس کے لیے مختص کی تھی۔

میں قائم کردہ "مراکش بیمارستان"[۳۲]، اسی جگہ سلطان عبداللہ الغالب باللہ (۱۵۵۷-۱۵۷۴) کا قائم کردہ ایک بیمارستان[۳۳]، سالی (Sale) کے مقام پر ۱۸۳۱-۱۸۳۲ میں علوی سلطان مولای عبدالرحمن بن ہشام (۱۷۷۸-۱۸۵۹) کا تعمیر کردہ بیمارستان[۳۴]، تونس میں سلطان ابوفارس الحفصی (۱۳۶۱-۱۴۳۴) کا ۱۴۲۰ میں قائم کردہ بیمارستان، غرناطہ میں بنو نصر کے سلطان محمد پنجم (۱۳۳۹-۱۳۹۱) کا ۱۳۶۷ میں قائم کردہ بیمارستان وغیرہ کافی اہم ہیں۔

ترک سلاطین نے بھی بیمارستان کے قیام پر خصوصی توجہ دی، البتہ انہوں نے اس کے لیے دارالشفاء، دارالعافیہ، تیمارخانہ کی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ پہلا سلجوقی دارالشفاء قیصری میں ۱۲۰۶ عیسوی میں قائم کیا گیا۔ اس کے بعد سیواس، دیویری، چانکیری، قسطمونی، قونیہ، توقاد، ارزروم، ارزنجان، ماردین، آماسیہ وغیرہ میں بیمارستان تعمیر کیے گئے۔[۳۵] اناطولیہ میں پہلا عثمانی بیمارستان برسہ میں "دارالشفاء یلدرم" تھا۔[۳۶] دوسرے بڑے بیمارستان میں محمد الفاتح دوم (۱۴۵۱-۱۴۸۱) کا قائم کردہ "دارالشفاء فاتح"[۳۷]، بایزید دوم (۱۴۸۱-۱۵۱۲) کا تعمیر کردہ بیمارستان[۳۸]، استنبول میں

---

[۳۲] ابویوسف یعقوب کو عمارتیں تعمیر کرانے کا بہت شوق تھا، نیز وہ اہل علم و دانش کی قدر بھی کرتا تھا، جب اس کے دربار میں اسپین کے مشہور اطباء ابن طفیل، ابن رشد، ابن زھر الحفید اور اس کے بیٹے وغیرہ کو شامل کرلیا تو پھر اس نے بطور خاص غیر ملکی امیر و غریب بیماروں کے لیے یہ بیمارستان تعمیر کرایا۔ اسی طرح اس نے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی پاگلوں، کوڑھیوں اور اندھوں کے لیے متعدد بیمارستان تعمیر کرائے تھے۔

[۳۳] اس بیمارستان کو بعد میں عورتوں کا جیل خانہ بنادیا گیا تھا۔

[۳۴] یہاں کے عوام اطباء سے زیادہ سیدی ابن عاشر (Sayyidi Ibn Ashir) کی درگاہ کی برکات (Baraka) پر بھروسہ کرتی ہے، اس لیے وہ درگاہ سے متصل اس بیمارستان کے اطباء کے پاس نہیں جاتی ہے۔

[۳۵] یہ عمومی بیمارستان تھے اور ان میں ہر طرح کے مریضوں کو داخل کیا جاتا تھا۔ ان میں اطباء، جراح، دواساز اور امراض چشم کے ماہرین ہوتے تھے۔ ان بیمارستانوں کے اخراجات کے لیے آزاد فنڈ ہوا کرتا تھا۔

[۳۶] اسے سلطان اورخان، مراد اول، یلدرم بایزید نے تعمیر کرایا تھا اور اس کا افتتاح ۱۳۹۹ عیسوی میں ہوا تھا۔ اسے یلدرم عمارتی (Yildirim Imareti) بھی کہا جاتا تھا، جو بیمارستان، حمام اور مسافرخانہ پر مشتمل تھا۔ بیمارستان کی متعدد مرتبہ مرمت کی گئی اور بالآخر انیسویں صدی کے وسط میں اسے "احمد وفیق پاشا اسپتال" (Ahmed Wefik Pasha Hospital) میں تبدیل کردیا گیا۔

[۳۷] اس کا افتتاح ۱۴۷۰ عیسوی میں ہوا تھا اور یہ اسپتال سلطان محمد دوم کے کالج (Kulliye) کا حصہ تھا۔ اس کے وقف نامے (Wakfiyye) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں میڈیکل اسٹاف کے علاوہ طلبہ کی بھی ایک بڑی تعداد رہتی تھی۔

۱۵۳۹عیسوی میں "خاصکی کا بیمار خانہ"[۳۹](Bimarkhane of Khasseki)، اسی جگہ ۱۵۵۵ میں "سلیمان کا دارالشفاء"، منیسہ(Manisa) میں ۱۵۳۹عیسوی میں "حافظ سلطان کا دارالشفاء"[۴۰]، استنبول میں ۱۵۸۳عیسوی میں "طوپ تاشی کا بیمار خانہ"[۴۱](Bimarkhane of Toptasi)، احمد اول(۱۶۰۳-۱۶۱۷) کے ذریعے تعمیر کردہ بیمارستان[۴۲] وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں فوجی ملازمت، لباس کی وضع قطع اور تعلیم وغیرہ کو عثمانی سلطنت نے جدید شکلوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان کے اثرات اسپتالوں پر بھی ہوئے اور ۱۸۴۳ میں استنبول میں "غرباء اسپتال" (Ghuraba Hospital)، سلطان محمود دوم(۱۸۰۸-۱۸۳۹) کا استنبول میں ۱۸۲۷ میں تعمیر کردہ ایک نیا "مدرسۃ الطب والجراحت"[۴۳]، سلطان عبدالحمید دوم(۱۸۴۲-1918) کے ذریعے ۱۸۹۸ میں بچوں کا ششلی(شیشہ دار) ہاسپٹل(Shishli Children's Hospital) وغیرہ قائم کیے گئے۔ ان

---

(۳۸) بایزید دوم نے ادرنہ(Edirne) میں دریائے تنجہ(Tunja River) کے کنارے ایک عمارت تعمیر کی تھی اور یہ اسپتال سلطان کے نام سے موسوم اسی عمارت کا ایک حصہ تھا۔ عمارت کی تعمیر ۱۴۸۶عیسوی میں شروع ہوئی اور آٹھ سال میں مکمل ہوئی۔ اسپتال کا بڑا عملہ ایک عرصے تک عوام کی خدمت کرتا رہا اور بقول Ewliya Celebi یہاں پر دس موسیقاروں پر مشتمل ایک عملہ تھا، جو مریضوں کو ساز بجا کر سنایا کرتے تھے۔

(۳۹) یہ اسپتال خرم سلطان بیگم، سلطان سلیمان اعظم کے نام پر تعمیر کیا گیا تھا۔

(۴۰) اسے حافظ سلطان کی والدہ کے اعزاز میں تعمیر کیا گیا تھا۔

(۴۱) اسے نور بانو سلطان، والدہ مراد سوم(۱۵۷۴-۱۵۹۵) کے نام پر تعمیر کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۷ تک یہ اسپتال عوام کی خدمت کرتا رہا تھا۔

(۴۲) احمد اول نے اسے اپنی مشہور مسجد سے قریب پرانے بازنطینی گھڑ دوڑ کے میدان کے عقب میں تعمیر کرایا تھا۔ اس اسپتال کا افتتاح ۱۶۱۶عیسوی میں ہوا تھا۔ اب اسے ایک نیا اسکول بنانے کے لیے مسمار کر دیا گیا ہے۔

(۴۳) یہ ایک جدید طرز کا اسپتال تھا، اس میں ابتداء میں اطالوی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی، لیکن ۱۸۳۹ میں آسٹریا سے کچھ قابل اساتذہ کے آجانے کے بعد فرانسیسی زبان میں تعلیم دی جانے لگی۔ اس کی توسیع سلطان عبدالمجید، سلطان عبدالعزیز اور سلطان عبدالحمید دوم کے ذریعے کی گئی۔ پھر اس میں کتے کے کاٹے کا ادارہ(Rabies Institute)، جراثیم پر تحقیق کا ادارہ(Bacteriological Institute) اور ٹیکے لگانے کا مرکز(Inoculation Centre) بھی شامل کر دیے گئے۔ یہاں کتے کے کاٹنے اور چیچک سے محفوظ کرنے کے انتظامات اسی وقت سے شروع ہو گئے تھے جب وہ سب یورپ میں شروع کیے گئے تھے۔ متعدد اطباء نے، جو مغربی زبانوں اور جدید طبی اسالیب کا علم رکھتے تھے، اس مدرسے سے گریجویشن کی سند حاصل کی اور پھر ان لوگوں نے اناطولیہ(Anatolia) کا رخ کیا اور وہاں جدید اسپتالوں کی بنیاد رکھی۔

کے علاوہ بھی ترکوں نے متعدد علاقوں میں دارالشفاء قائم کیے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پانچ صدیوں میں ترکوں نے صرف استنبول میں ہی ستر (۷۰) سے زائد دارالشفاء قائم کیے تھے۔

نظام اور خصوصیات: اسلامی تاریخ کے متعدد ادوار میں قائم شدہ بیمارستانوں کے مصارف کے لیے حکومتِ وقت یا وزراء اور امراء کی جانب سے متولی یا مہتمم کی نگرانی میں اوقاف متعین تھے اور ان کی آمدنی سے ہی ان کا خرچ پورا کیا جاتا تھا۔[۴۴] ان کے نظام اور خصوصیات تقریباً یکساں تھیں۔ بسا اوقات خلیفہ وقت بیمارستانوں کا دورہ کرکے ان مسائل اور مریضوں کا حال واحوال دریافت کرتے تھے۔ ذیل میں ان کے نظام اور خصوصیات میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے:

بیمارستانوں کا نظام: بیمارستان بالعموم مختلف شعبوں کے لیے وارڈ، باہری مریضوں کے لیے کلینک، ڈسپنسری، لیباریٹری، آپریشن تھیٹر، لیکچر ہال، لائبریری، مکانات، عبادت گاہ، حمام، باورچی خانہ اور اسٹور روم وغیرہ پر مشتمل ہوتے تھے۔ تمام بیمارستانوں میں مختلف امراض کے لیے مخصوص شعبے ہوا کرتے تھے، جیسے داخلی امراض کا شعبہ، جس میں بعض ذیلی شعبے جیسے بخار کا شعبہ، پیٹ اور بدہضمی کا شعبہ وغیرہ تھے، اسی طرح آنکھ کا شعبہ، جراحت کا شعبہ، دماغی امراض کا شعبہ، ٹوٹے ہوئے اعضاء یا ہڈیوں پر پٹی یا پلاسٹر باندھنے کا شعبہ اور جراحت کا شعبہ وغیرہ بھی تھا۔ ہر شعبے کے ایک صدر اور منتظم ہوا کرتے تھے، جن کے ماتحت اس میدان کے ماہر اطباء جیسے طبائعین (Physiologists)، کحالین (Oculists)، جراحین (Surgeons)، مجبّرین (Bonesetters) وغیرہ ہوتے تھے۔ اطباء کے نظام الاوقات متعین تھے اور وہ اپنے مقررہ وقتوں میں متعلقہ شعبوں میں بیٹھ کر مریضوں کو دیکھا کرتے تھے۔ پورے بیمارستان کا بھی ایک ذمہ دار ہوا کرتا تھا جسے "ساعور"[۴۵] (Saur) یا رئیس الاطباء کہا جاتا تھا۔ اسی طرح ہر بیمارستان میں منشی، کلرک، عطار اور نرس (مرد اور عورت

---

[۴۴] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: N. Sehsuvaroglu, Bedi, "Bimaristan", in *The Encyclopaedia of Islam*, 1986, Edited by H. A. R Gibb *et al*., E. J. Brill, Leiden, and Volume. I, p. 1223

[۴۵] ساعور سریانی لفظ "ساعورا" سے ہے۔ اس کا لفظی معنی ہے: "بیماری کا انسپکٹر"، موجودہ زمانے میں اسے چیف فزیشین (Chief Physician) سے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی کے ماتحت بیمارستان کا سارا عملہ کام کیا کرتا تھا۔ اس عہدے پر تقرر حکومت وقت کے ذریعے کیا جاتا تھا اور سب سے پہلے بختیشوع کو اس عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔ مختلف ادوار میں یوحنا ابن ماسویہ، سابور بن سہل، ابوبکر رازی، جبرئیل بن عبداللہ، ابوعثمان سعید بن یعقوب الدمشقی، سنان بن ثابت، ابن التلمیذ، مہذب الدین عبدالرحیم ابن علی الدخوار اورابن النفیس نے بطور ساعور اپنی خدمات انجام دیں۔

دونوں) کے علاوہ دیگر معاونین، جیسے دوائیں کوٹنے والے، نسخے کے مطابق دوا تیار کرنے والے، مرہم پٹی کرنے والے، کھانا پکانے والے، خدام اور صفائی ستھرائی کرنے والے بھی ہوا کرتے تھے۔ ان تمام ملازمین کی ڈیوٹیاں دن اور رات میں حسب سہولت تبدیل کی جاتی تھیں، نیز ان تمام ذمے داروں کو حکومت کی طرف سے حسب مراتب متعین کردہ تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں۔

بیمارستانوں میں دواخانے (Pharmacies) بھی تھے، ان کو "خزانۂ مشروبات" کہا جاتا تھا۔ ان میں متعدد قسم کی دوائیں، معجون، مربے، عرق وغیرہ ہوتے تھے، بعض دوائیں ایسی بھی تھیں جو صرف سرکاری بیمارستانوں میں ہی دستیاب رہتی تھیں، ان دواؤں کو دور دراز علاقوں سے منگایا جاتا تھا جیسے رشید الدین طبیب نے سلطان علاء الدین کے زمانے میں ہندوستان کا دورہ اسی مقصد سے کیا تھا کہ یہاں کی نایاب دواؤں کو ایران بھیجا جاسکے۔ اس میدان کے ماہرین کو دواخانوں میں ملازمت دی جاتی تھی، نیز حکومت کی طرف سے دوافروشوں، دواؤں کی حالت اور ان کی قیمتوں کی نگرانی کی جاتی تھی اور دھوکے باز دوا فروشوں کو سزائیں بھی دی جاتی تھیں۔ بعض افراد اپنے ذاتی دواخانے بھی کھولتے تھے، البتہ اس کے لیے انہیں ایک امتحان پاس کرکے لائسنس یا اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ دواخانوں میں جراحی آلات اور متعدد قسم کے برتن وغیرہ بھی دست یاب تھے، البتہ شاہی افراد کے برتن وغیرہ شیشوں کے نفیس قسم کے ہوتے تھے، جب کہ عام لوگوں کے لیے عمومی قسم کے برتن مستعمل تھے۔

ابتداء میں طب کے طالب علم کو کوئی ڈگری یا سند وغیرہ نہیں دی جاتی تھی، وہ کسی طبیب کے ماتحت رہ کر علم طب حاصل کرتا تھا اور جب طبیب مطمئن ہو جاتا کہ اب وہ بغیر کسی نگرانی کے مریضوں کا علاج کرسکتا ہے تو پھر اسے مریض دیکھنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ اس حوالے سے خلیفہ مقتدر باللہ (۹۰۸۔ ۹۳۲) کا واقعہ قابل ذکر ہے کہ ان کے دور میں ایک ڈاکٹر کے علاج سے ایک مریض کی موت ہوگئی تو انہوں نے سنان بن ثابت بن قرۃ، رئیس الاطباء بغداد کو حکم دیا کہ وہ بغداد کے تمام اطباء کا امتحان لیں۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ صرف بغداد میڈیکل کالج سے ۹۳۱عیسوی میں امتحان میں کام یاب ہونے والے اطباء کی تعداد آٹھ سو ساٹھ سے زائد تھی، البتہ شاہی اطباء اور معروف اطباء کو اس امتحان سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد قانون بنا دیا گیا کہ بیمارستانوں میں ہر کسی کو مریضوں کا علاج کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس کے لیے پہلے طالب علم کو طب کی تعلیم حاصل کرنی پڑے گی، اس کے بعد اسے حکومت کی طرف سے متعین کردہ رئیس الاطباء کے سامنے ایک تحریری امتحان اور ایک مناقشہ یا انٹرویو دینا ہوگا۔ تحریری امتحان کی شکل یہ تھی کہ طالب علم کو متعلقہ فن میں ایک رسالہ لکھنا ہوگا، یا کسی دوسرے کی تصنیف پر اپنے افکار و نظریات پیش کرنے

ہوں گے۔ اس طرح انٹرویو میں رئیس الاطباء طالب علم سے متعلقہ مضامین میں تفصیلی بحث و مباحثہ کرتے اور مطمئن ہونے کے بعد ہی اسے پریکٹس کرنے کی سند یا اجازت دیا کرتے تھے۔[۴۶] کام یاب ہونے والے اطباء کے نام ایک رجسٹر میں درج کیے جاتے تھے۔ بالعموم اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا تھا کہ ممتحن حضرات اپنے فن کے ماہر، ایمان دار اور دین دار ہوں، تاکہ کسی نااہل کو طب کی سند نہ مل سکے۔ احمد عیسیٰ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ دست یاب معلومات کے مطابق الشیخ شہاب الدین ابن الصائغ، رئیس الاطباء، مصر نے شمس الدین محمد بن عزام کو طب کے میدان میں پہلی سند (الاجازۃ) دی تھی۔[۴۷]

بیمارستانوں کی خصوصیات: بیمارستانوں کو بالعموم پہاڑی علاقوں یا دریا کے کنارے تعمیر کیا جاتا تھا، تاکہ مریضوں کو صاف ستھری اور تازی فضا و ہوا مل سکے۔ اس کے لیے باقاعدہ پہلے جگہ اور آب و ہوا کا مشاہدہ کیا جاتا تھا، اس کے بعد تعمیری کام شروع کیا جاتا تھا۔ بیمارستانوں کے دروازے بلا تفریق خاص وعام، مذہب وملت، امیر وغریب، مرد وعورت، بوڑھوں، بچوں، مقامی وغیر مقامی اور ملکی وغیر ملکی سب کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے اور ان میں لوگوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا، نیز انہیں دوائیں بھی مفت میں دی جاتی تھیں۔

بیمارستانوں کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ مردوں اور عورتوں کے شعبے ایک دوسرے سے بالکل علاحدہ ہوتے تھے اور ان میں ملازمین بھی الگ الگ ہوتے تھے، یعنی مردوں کے شعبہ میں مرد ملازمین اور خواتین کے شعبہ میں خواتین ہی کام کیا کرتی تھیں۔ ان بیمارستانوں کو بالعموم دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ باہری حصے میں اطباء مریضوں کا معائنہ کرتے تھے اور اگر بیماری معمولی ہوتی تو انہیں نسخہ دے کر دواخانے بھیج دیا جاتا تھا کہ وہ اپنی دوائیں لے کر گھر واپس ہو جائیں، لیکن اگر بیماری بڑی ہوتی تھی تو رجسٹر میں مریض کا اندراج کرنے کے بعد اسے حمام بھیج دیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے کپڑے بدل کر بیمارستان کا مخصوص لباس پہن لے اور پھر اس کے بعد اسے بیمارستان کے اندرونی حصے کے ایک مخصوص کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا، جو وسیع، ہوادار اور صاف ستھرے ہوا کرتے تھے۔ اس میں مریض کے لیے صاف ستھری چادر کے ساتھ ریشم، چمڑے، اون اور کتان وغیرہ سے بنے ہوئے بستر

---

[۴۶] سوالات کس طرح کے ہوتے تھے؟ اس حوالے سے عبدالعزیز مسطبب کی کتاب "امتحان الالباء لکافۃ الاطباء" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

[۴۷] أحمد عیسیٰ، تاریخ البیمارستانات فی الاسلام، مؤسسۃ ھنداوی، المملکۃ المتحدۃ، ۲۰۱۱، ص ۳۰

لگے ہوتے تھے۔ سرد موسم میں اسے گرم کپڑے، کمبل یا لحاف اور کوئلہ وغیرہ بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ مریض کو ڈاکٹر کی تجویز کردہ دواؤں کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت مناسب غذا دی جاتی تھی۔ اس حوالے سے ملازمین کو ہدایت تھی کہ وہ ہر مریض کے لیے مقوی کھانا ایک مخصوص پلیٹ میں ڈھانپ کر لے جائیں اور کسی دوسرے کو اس میں کھانے کی اجازت نہ دیں۔ علاج کی مدت مریض کے صحت یاب ہونے یا وفات پانے تک تھی۔ جب مریض صحت یاب ہونے لگتا تو اسے مقررہ روٹی اور ایک پوری مرغی کھلا کر دیکھا جاتا کہ وہ اسے ہضم کرلیتا ہے یا نہیں؟ ہضم کر لینے کی صورت میں اسے خواہ وہ امیر ہو یا غریب، مقامی ہو یا غیر مقامی، شفاخانے سے نئے لباس اور کسی قدر سرمائے کے ساتھ رخصت کر دیا جاتا تھا، البتہ غرباء کی رقم تھوڑی زیادہ ہوتی تھی تاکہ وہ کم زوری کے دنوں میں بے فکری سے گھر پر رہ سکیں یا اپنا کاروبار شروع کر سکیں، اسے ''زادالسلام'' کہا جاتا تھا۔ بعض بیمارستان جیسے قاہرہ کے منصوری بیمارستان میں یہ سہولت بھی تھی کہ اگر کوئی مریض اپنا علاج کسی مجبوری کے تحت گھر پر ہی کرانا چاہ رہا ہو تو اسے جس دوا کی ضرورت ہے اسے بیمارستان کی طرف سے گھر پر مہیا کرائی جائے گی، نیز اگر اس کا گھر پر ہی انتقال ہو جائے تو تدفین کا تمام خرچ بھی منصوری بیمارستان ہی برداشت کرے گا۔

بعض بیمارستانوں میں مریضوں (بالخصوص بے خوابی کے شکار لوگوں) کا نفسیاتی علاج کیا جاتا تھا اور اس کے لیے قصہ گو، سازندے اور موسیقار کو مقرر کیا جاتا تھا، ان کا کام مریضوں کو موسیقی، قصے، کہانیاں اور لطائف وغیرہ سنا کر تفریح کرانا تھا۔ دیہاتیوں کو دیسی رقص وغیرہ سے محظوظ کرایا جاتا تھا۔ اسی طرح مریضوں کو موذنوں کے ذریعے خوش کن آواز میں قرآن کریم کی تلاوت، اذان اور اشعار سنانے کا بھی رواج تھا تاکہ وہ خود کو پرسکون اور بہتر محسوس کریں۔ ڈاکٹر مصطفی السباعی نے اس حوالے سے لکھا ہے:

> طرابلس میں ایک عجیب وقف ہے، جس کی آمدنی دو ایسے اشخاص کے لیے مخصوص ہے جو روزانہ بیمارستانوں میں جائیں اور سرگوشی میں کچھ اس طرح مریض کے بیچ باتیں کریں کہ وہ سن لے اور اس سے وہ یہ اثر لے کہ وہ اچھا ہو رہا ہے، اس کا چہرہ سرخ دکھائی دے رہا ہے اور اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی ہے۔ [۴۸]

---

[۴۸] السباعی، مصطفی، من روائع حضارتنا، دارالسلام للطباعة والنشروالتوزیع والترجمة، القاهرة، ۱۹۹۸، ص:۱۱۳

مریض کی عام ضروریات جیسے کھانے پینے کی چیزیں، سرمہ، تیل، مرہم، برتن، رکابی، پیالہ، گلاس، صراحی، کوزہ، پنکھا، بستر، تکیہ اور بچھونا وغیرہ کو وقف کی آمدنی سے پوری کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اگر کسی مریض کی بیمارستان میں وفات ہو جاتی تھی تو اس کی تدفین جس میں گرم پانی، غسل، خوشبو، کفن، قبر کھودنا وغیرہ کا مرحلہ شامل ہے، سب کا خرچ اسی بیمارستان کے وقف کی آمدنی سے ادا کیا جاتا تھا۔

بیمارستانوں میں ایک بڑا کانفرنس ہال "الایوان الکبیر" ہوتا تھا، جس میں علم طب پر رئیس الاطباء کی زیر نگرانی عام اطباء مختلف موضوعات پر لیکچرز دیا کرتے تھے۔ اسی طرح جب اطباء مریضوں کے معائنہ اور علاج سے فارغ ہو جاتے تو طلبہ ان کے سامنے بیٹھ کر طبی کتابوں کی درس و تدریس کے علاوہ مختلف مضامین پر عموماً تین گھنٹے تک بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ اسی طرح طلبہ اطباء کے زیر نگرانی بیمارستانوں میں پریکٹیکل کیا کرتے تھے، جسے موجودہ دور میں "System of Internship and Externship" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ بیمارستان بیک وقت اسپتال بھی تھے اور میڈیکل کالج بھی، یعنی ان میں مریضوں کا علاج و معالجہ کیا جاتا تھا اور نئے ڈاکٹروں کو پریکٹس بھی کرائی جاتی تھی۔ موفق الدین ابوالعباس احمد ابن اصیبعہ (۱۲۰۳-۱۲۷۰) نے دمشق کے نوری بیمارستان سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد لکھا:

> جب حکیم مہذب الدین اور حکیم عمران اسپتال میں بیماروں کے معائنہ اور معالجہ سے فارغ ہوتے تو میں ان کے ساتھ ہوتا اور میں شیخ رضی الدین رحبی کے پاس بیٹھ جاتا اور مریضوں کے امراض کی تشخیص کے متعلق ان کے استدلال کا طریقہ دیکھتا، جو کچھ وہ مریضوں کے متعلق بیان کرتے اور جو کچھ ان کے لیے لکھتے، ان میں سے اکثر امراض اور ان کے لیے تجویز کردہ دواؤں کے بارے میں، ان سے بحث بھی کرتا تھا۔"[۴۹]

بیمارستانوں میں بالعموم ایک مسجد اور ایک بڑی لائبریری بھی ہوا کرتی تھی جن سے اطباء اور طلبہ دونوں ہی مستفید ہوتے تھے۔ تاریخ میں درج ہے کہ قاہرہ کے بیمارستان ابن طولون کی لائبریری میں ایک لاکھ سے زائد کتابیں علم طب اور اس کے مختلف گوشوں پر موجود تھیں۔ بیمارستانوں کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی کہ ان میں طبی اخلاقیات کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے ان میں یہودی، عیسائی اور بعض دیگر مذاہب کے اطباء اور ملازمین وغیرہ کو بھی آسانی سے ملازمت مل جاتی

---

(۴۹) من روائع حضارتنا، دارالسلام، للطباعة والنشر والتوزیع والترجمة، القاهرة، ۱۹۹۸، ص ۱۰۹

تھی۔ اسی طرح اطباء کو ہدایت دی جاتی تھی کہ وہ بلا کسی تفریق نسل، مذہب وملت، دوست ودشمن اورامیر وغریب سب کا علاج کریں۔ حکومتوں کی جانب سے جعلی یا فرضی اطباء کو پکڑنے کی مہم بھی چلائی جاتی تھی، تاکہ کسی کا جانی ومالی نقصان نہ ہو۔

مسلمانوں نے علم طب کے علاوہ اس کے دو اہم گوشوں: طبی اخلاقیات اور بیمارستان کی خصوصیات پر کتابیں تصنیف کیں۔ اسحٰق بن علی راہویہ نے پہلی بار طبی اخلاقیات پر ایک کتاب ”ادب الطبیب“ (Adab al-Tabib) کے نام سے لکھی جس میں اس نے ڈاکٹروں کے لیے اخلاقیات وہدایات وغیرہ پر خصوصی زور دیا تھا۔ ابو بکر الرازی نے بیمارستان پر ”فی صفات البیمارستان“ کے نام سے لکھی۔ بہر حال مسلمانوں کے ذریعے قائم کردہ خدمت خلق کے ایک اہم ترین شعبے بیمارستانوں کی تفصیلات سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اس میدان میں اعلیٰ انسانی جذبات واحساسات کے ساتھ ساتھ شفقت ومحبت کی غیر معمولی مثالیں پیش کی ہیں، نیز ایک ایسے نظام کو جاری کیا تھا جس سے امیر وغریب، اسیر وآزاد، مسلم اور غیر مسلم سب نے فائدہ اٹھایا تھا۔

☆☆☆

جامعات میں مطالعۂ شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

رفیق اعزازی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

azmi408@gmail.com

مطالعۂ شبلی پر پہلی کتاب ''تذکرہ شمس العلما مولانا شبلی مرحوم'' محمد مہدی نے لکھی، جو اسلامیہ کالج اٹاوہ سے 1925ءمیں بشیر پاشا سیریز کے تحت شائع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۴۳ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ایک مبسوط سوانح عمری ''حیات شبلی'' شائع ہوئی، جس نے، بقول پروفیسر آل احمد سرور، مولانا حالیؔ سے وہ تاجِ فضیلت چھین لیا جو ''حیات جاوید'' کی بدولت ان کے سر تھا۔ ''حیات شبلی'' کی تصنیف پر اب پون صدی سے زاید کا عرصہ گذر چکا ہے، تاہم مطالعۂ شبلی کا بنیادی مآخذ اب تک اسی کے اوراق ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کی ہشت پہل شخصیت کی طرح مطالعات شبلی میں بھی بڑا تنوع اور گونا گونی ہے۔ اس کا اندازہ ناچیز کی مرتبہ ''کتابیات شبلی'' مطبوعہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی (۲۰۱۱ء) کے مشمولات سے لگایا جا سکتا ہے۔ مطالعۂ شبلی کا ایک اہم پہلو جامعات میں مختلف علوم و فنون میں لکھے جانے والے بی اے، ایم اے، ایم ایس اور پی ایچ ڈی کے علمی و تحقیقی مقالات بھی ہیں، جن کی جانب اب تک توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ''کتابیات شبلی'' کی ترتیب کے زمانے میں ہندو پاک کی جامعات میں لکھے جانے والے تیس تحقیقی مقالات کی تفصیلات راقم کو دستیاب ہوئی تھیں۔ اس کے بعد مطالعۂ شبلی کے متعدد نئے اور پرانے تحقیقی مقالات کا علم ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ''کتابیات'' کی اشاعت کے چودہ سال بعد اس کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ شبلی شناسی کے لئے ضروری ہے کہ یہ مقالات اہل علم اور قدر شناسان شبلی کی نگاہ میں ہوں۔ اسی غرض سے یہ اشاریہ مرتب کیا گیا ہے اور جو مقالات شائع ہو گئے ہیں ان کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

پی ایچ ڈی:

۱۔ اردو کی ترقی میں دارالمصنّفین کا حصہ۔ مقالہ نگار: خورشید مظہر الحق نعمانی، نگراں: ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی، الحاق شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی، ۱۹۷۶ء۔ پروفیسر خورشید نعمانی مرحوم کا یہ مقالہ ''دارالمصنّفین کی ادبی خدمات'' کے عنوان سے ۱۹۷۷ء میں رحیمی پریس ممبئی سے شائع ہوا۔ بعد میں یونیورسٹی گرانٹ پروجیکٹ کے طور پر انہوں نے اس میں

قابل ذکر اضافہ کیا، جسے دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ نے دو جلدوں میں "دار المصنّفین کی تاریخ اور علمی خدمات" کے نام سے ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۴ء میں شائع کیا۔

۲۔ اردو ادب کی نشاۃ ثانیہ اور شبلی۔ مقالہ نگار: محمد جعفر احراری، نگراں: ڈاکٹر اسلم پرویز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی، ۱۹۹۹ء، صفحات: ۲۶۴۔

۳۔ الشیخ شبلی النعمانی (عربی)۔ مقالہ نگار: جلال سعید حفناوی، قاہرہ یونیورسٹی، قاہرہ۔ ۱۹۹۵ء

۴۔ حالی اور شبلی کے تنقیدی نظریات کا تقابلی مطالعہ۔ مقالہ نگار: پروین بانو، نگراں: ڈاکٹر شباب الدین وی، بی، ایس، پوروانچل یونیورسٹی جون پور، ۲۰۰۷ء، صفحات: ۲۶۰۔

۵۔ حالی اور شبلی کے تنقیدی نظریات کا تقابلی مطالعہ۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر شہباز اختر، نگراں: پروفیسر شہریار، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۶ء، صفحات: ۲۴۳۔

۶۔ حالی و شبلی کی علمی خدمات کا تقابلی جائزہ۔ مقالہ نگار: نبیل مشتاق، نگراں: ڈاکٹر زاہد منیر عامر، پشاور یونیورسٹی پشاور پاکستان۔ ۲۰۱۸ء۔

۷۔ دار المصنفین کا ایتہاسک ادھین (۱۹۱۴ سے ۱۹۴۷ء) مقالہ نگار: نظام الدین، نگراں: جاوید علی خان، وی، بی، ایس، پوروانچل یونیورسٹی جون پور، ۲۰۱۶ء، صفحات: ۱۸۹۔

۸۔ دار المصنّفین کی تاریخی خدمات۔ مقالہ نگار: محمد الیاس الاعظمی، نگراں: ڈاکٹر اشفاق احمد صدیقی (اعظمی)، شعبہ اردو شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ، الحاق پوروانچل یونیورسٹی جون پور، ۱۹۹۸ء، صفحات: ۳۷۵۔ یہ مقالہ ۲۰۰۲ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے شائع ہوا۔

۹۔ دار المصنّفین کی عربی خدمات۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر محمد عارف عمری اعظمی، نگراں: ڈاکٹر عبید اللہ فراہی، شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ، ۲۰۰۲ء۔ یہ مقالہ اپریل ۲۰۱۳ء میں ادبی دائرہ اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔

۱۰۔ دبستان شبلی اترپردیش میں تعلیمی ترقی کا مطالعہ (مسلمانوں کے خصوصی حوالہ سے) مقالہ نگار: ڈاکٹر نیاز احمد اعظمی، شعبہ تعلیمات، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ۱۹۷۷ء۔

۱۱۔ دبستان شبلی کی تنقید نگاری۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر کہکشاں آفتاب، نگراں: پروفیسر عبد الحامد، الٰہ آباد یونیورسٹی الٰہ آباد، ۲۰۰۹ء۔ اس مقالہ کو مصنفہ نے ۲۰۱۷ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔

۱۲۔ دبستان شبلی کے علمی و ادبی کارنامے۔ مقالہ نگار: شاہ محمد نعیم ندوی، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی، سندھ، جام شورو، ۱۹۷۱ء۔

۱۳۔ سرسید اور شبلی۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر محمد فاروق دیوا، نگراں: ڈاکٹر بصیر احمد، ہمدرد یونیورسٹی دہلی۔ یہ مقالہ ۱۹۹۹ء میں گلشن پبلشرز سری نگر کشمیر سے شائع ہوا۔

۱۴۔ سیرت میں شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے خیالات کا تقابلی جائزہ۔ مقالہ نگار: محمد جاوید حیات، نگراں: ڈاکٹر عبد الرؤف ظفر، شعبہ علوم اسلامی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور۔

۱۵۔ شبلی اور ان کی تصانیف۔ مقالہ نگار: آفتاب احمد صدیقی، نگراں: رشید احمد صدیقی، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۴۸ء، صفحات: ۳۱۱۔ یہ پہلا تحقیقی مقالہ ہے جو علامہ شبلی پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لکھا گیا۔ یہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے، مگر پی ڈی ایف کی شکل میں انٹرنیٹ پر موجود ہے۔

۱۶۔ شبلی بحیثیت سوانح نگار: ایک تنقیدی مطالعہ۔ مقالہ نگار: نیر جہاں، نگراں: ڈاکٹر صغرا مہدی، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ یہ مقالہ ”مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ“ کے عنوان سے ۱۹۹۹ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع ہوا۔

۱۷۔ شبلی کا ذہنی ارتقاء۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی، نگراں: ڈاکٹر غلام مصطفی خاں، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سندھ، جام شورو حیدرآباد، ۱۹۶۶ء۔ یہ مقالہ مجلس یادگار ہاشمی کراچی سے غالباً ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔

۱۸۔ شبلی کا نظام نقد اور اردو تنقید پر اس کے اثرات۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر شاداب عالم، نگراں: پروفیسر محمد شاہد حسین، شعبہ اردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ یہ مقالہ ”تنقیدی مباحث اور شبلی کا نظام نقد“ کے عنوان سے ہندوپاک سے شائع ہوا ہے۔

۱۹۔ شبلی کا نظریہ شعر اور اس کی جہتیں۔ مقالہ نگار: غلام نبی بٹ، نگراں: پروفیسر نذیر احمد ملک، شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی، کشمیر، ۲۰۰۴ء۔

۲۰۔ شبلی کی تاریخ نویسی: ایک تجزیاتی مطالعہ۔ مقالہ نگار: عبد الجلیل بھٹی، نگراں: پروفیسر عبد الرشید خاں، شعبہ تاریخ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، پنجاب، ۲۰۰۷ء۔

۲۱۔ شبلی کے تنقیدی نظریات۔ مقالہ نگار: غضنفر علی، نگراں: ڈاکٹر نورالحسن نقوی، شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۸۲ء، صفحات: ۲۵۲۔

۲۲۔ شبلی کے تنقیدی نظریات شعر العجم جلد چہارم کی روشنی میں۔ مقالہ نگار: شکیل احمد، نگراں: ڈاکٹر شارب ردولوی، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

۲۳۔ شبلی کی سیرت نگاری۔ مقالہ نگار: ارشد جمال، نگراں: ڈاکٹر خواجہ محمد حامد، شعبہ اردو، ناگ پور یونیورسٹی، ناگ پور، ۱۹۷۹ء۔ یہ مقالہ ستمبر ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔

۲۴۔ شبلی کی شاعری اور نثری خدمات کا تنقیدی مطالعہ۔ جمیلہ عرشی، شعبہ اردو راجستھان

یونیورسٹی، جے پور۔

۲۵۔ شبلی کی علمی وادبی خدمات۔ مقالہ نگار: ظفر احمد صدیقی، نگراں: پروفیسر حکم چند نیرؔ، (م: ۱۷/ستمبر ۱۹۹۲ء) بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، ۱۹۸۱ء۔ یہ مقالہ شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔

۲۶۔ شبلی کے کارنامے۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر اشرف النبی قیصر، نگراں: ڈاکٹر عبدالواسع، شعبہ اردو، باباصاحب بھیم راؤ امبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفر پور۔ ۱۹۸۸ء۔

۲۷۔ شبلی کی نثر۔ مقالہ نگار: محمد شمیم، نگراں: ڈاکٹر احمر لاری، شعبہ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور اترپردیش، ۱۹۸۶ء۔

۲۸۔ شبلی کی نثر کا تنقیدی مطالعہ۔ مقالہ نگار: خضر حیات، نگراں: ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ ۲۰۰۵ء۔

۲۹۔ شبلی نعمانی بحیثیت تنقید نگار۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر صابرین خاتون، نگراں: پروفیسر قمر اعظم ہاشمی، باباصاحب بھیم راؤ امبیڈکر بہار یونیورسٹی مظفر پور، ۱۹۹۱ء۔

۳۰۔ شبلی نعمانی بحیثیت سوانح نگار۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر طلعت ظفر، نگراں: ڈاکٹر اشفاق احمد صدیقی اعظمی، پوروانچل یونیورسٹی، جون پور ۱۹۹۷ء، صفحات: ۴۲۶۔

۳۱۔ شبلی نعمانی بحیثیت سوانح نگار۔ مقالہ نگار: قیصر النبی، شعبہ اردو مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا۔ ۱۹۸۸ء

۳۲۔ شبلی نعمانی بحیثیت مؤرخ اسلام۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر غلام غازی خاں، شعبہ اردو، باباصاحب بھیم راؤ امبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفر پور، ۱۹۸۸ء۔ یہ مقالہ ۲۰۱۹ء میں عرشیہ پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوا۔

۳۳۔ شبلی نعمانی سوانح نگار اور مورخ کی حیثیت سے۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر محمد جمیل اختر، نگراں: پروفیسر محمد طیب صدیقی، شعبہ اردو، للت نرائن متھلا یونیورسٹی۔ ۱۹۹۵ء۔

۳۴۔ شبلی نعمانی کی سوانح نگاری کا تنقیدی جائزہ۔ مقالہ نگار: شوکت آرا، نگراں: پروفیسر عبدالواسع، شعبہ اردو، باباصاحب بھیم راؤ امبیڈکر بہار یونیورسٹی مظفر پور۔ ۱۹۹۲ء۔

۳۵۔ شبلی نعمانی کی ''سیرۃ النبی'' کا اسلوبیاتی مطالعہ۔ مقالہ نگار: تقویم الحق، نگراں: ڈاکٹر بادشاہ منیر بخاری، جامعہ پشاور، ۲۰۱۱ء۔

۳۶۔ شبلی نعمانی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر شیخ عبدالرحیم انصاری، نگراں: پروفیسر وہاب اشرفی، شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی رانچی۔ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ کے تعاون سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔

۳۷۔ عطیہ فیضی، شبلی نعمانی، علامہ اقبال سے روابط کی نوعیت اوراثر پذیری کا تحقیقی تجزیہ۔ مقالہ نگار: محمد یامین، کراچی یونیورسٹی، کراچی۔

۳۸۔ علامہ شبلی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ مقالہ نگار: احسان احمد اعظمی۔ پوروانچل یونیورسٹی، جون پور، ۲۰۱۰ء۔

۳۹۔ علامہ شبلی کی نثری خدمات۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر محمد نصیر، نگراں: ڈاکٹر عبدالواسع، شعبہ اردو باباصاحب بھیم راؤامبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفرپور، ۱۹۸۶ء۔

۴۰۔ علامہ شبلی نعمانی۔ مقالہ نگار: عمدۃ النساء بیگم۔ شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد۔

۴۱۔ علامہ شبلی نعمانی اوران کی علمی وادبی خدمات۔ مقالہ نگار: راشد علی مئوی، نگراں مولانا محمد اسلام قاسمی، کلیہ حدیث وادب عربی، دارالعلوم وقف دیوبند۔

۴۲۔ علامہ شبلی نعمانی بحیثیت سوانح نگار۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر صفیہ بی، نگراں: ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی، کالی کٹ یونیورسٹی کالی کٹ۔ یہ مقالہ مصنفہ نے جے ایم پراسس چینائی (مدراس) سے شائع کیا ہے۔ صفحات ۲۸۸۔ ان کے قلم سے ایک اور کتاب "جہان شبلی" بھی شائع ہوئی ہے۔

۴۳۔ علامہ شبلی نعمانی بحیثیت شاعروادیب۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر شبنم اکبر، نگراں: پروفیسر ملک زادہ منظوراحمد، شعبہ اردو لکھنؤیونیورسٹی لکھنؤ۔ یہ مقالہ "شبلی نعمانی بحیثیت شاعر" کے عنوان سے ۲۰۱۲ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۴۴۔ علامہ شبلی نعمانی کے اردوادب پر اثرات۔ مقالہ نگار: فیاض تقی، نگراں: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔

۴۵۔ علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور شاعری۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر مطیع الرحمن غاسق، نگراں: ڈاکٹر منور انجم، وی، بی، ایس، پوروانچل یونیورسٹی جون پور، ۲۰۰۸ء، صفحات: ۴۹۰۔ یہ مقالہ عدیلہ پبلی کیشنز مئو سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔

۴۶۔ علامہ شبلی نعمانی کے فن سوانح نگاری کا تحقیقی مطالعہ۔ مقالہ نگار: عباس حیدر، نگراں: زاہد علی زاہدی، کلیہ معارف اسلامی، یونیورسٹی آف کراچی، سندھ، ۲۰۱۱ء، صفحات: ۴۵۹۔

۴۷۔ عہد شبلی کے تنقیدی تصورات۔ مقالہ نگار: ارشاد احمد خاں، نگراں: پروفیسر امیر عارفی، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

۴۸۔ مکتوبات شبلی کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔ مقالہ نگار: ابورافع، نگراں: ڈاکٹر شباب الدین، ویربہادرسنگھ پوروانچل یونیورسٹی جون پور، ۲۰۲۱ء، صفحات: ۳۰۷۔

۴۹۔ مولانا شبلی نعمانی اور اردوادب میں ان کی خدمات۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر مسعودالحسن عثمانی، شعبہ

اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ۔ یہ مقالہ "مولانا شبلی نعمانی شخصیت اور ادبی خدمات" کے نام سے ۲۰۲۳ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۵۰۔ مولانا شبلی نعمانی کی سوانح نگاری میں ادبی و تاریخی بصیرت۔ مقالہ نگار: حافظ قاری ڈاکٹر محمد نصیر الدین منشاوی، نگراں: پروفیسر فاطمہ بیگم، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ مصنف نے ۲۰۱۸ء میں حیدرآباد سے شائع کیا ہے۔

ایم فل:

۵۱۔ الفاروق (شبلی نعمانی) اور شاہکارِ رسالت (پرویز) کا تقابلی و تحقیقی جائزہ۔ مقالہ نگار: عبدالغفار، نگراں: ڈاکٹر سلطان محمود کھوکھر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، پنجاب پاکستان

۵۲۔ برصغیر میں علامہ شبلی نعمانی کی سیرت نگاری پر تنقیدات کا تحقیقی جائزہ۔ مقالہ نگار: نمرہ نصیر، نگراں: حافظ محمد نعیم، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی آف لاہور۔

۵۳۔ تدوینات مکاتیب شبلی: ایک جائزہ۔ مقالہ نگار: نمرہ احمد، نگراں: ڈاکٹر خالد ندیم، شعبہ اردو یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۲۳-۲۰۲۱ء۔

۵۴۔ دعوتی خطوط: مولانا ادریس کاندھلوی اور مولانا شبلی نعمانی کی سیرت نگاری کا ایک تحقیقی جائزہ مقالہ نگار: حمیرا جبیں، نگراں: عبدالقادر بزدار، شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، پاکستان۔

۵۵۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور شبلی نعمانی کا سیرت نگاری میں منہج و اسلوب۔ مقالہ نگار: محمد شفیق علوی، نگراں: منیر احمد، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور پاکستان۔

۵۶۔ سیرۃ النبیؐ از شبلی نعمانی پر مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور علامہ نور بخش توکلی کی تنقیدی آراء کا جائزہ۔ مقالہ نگار: سمیہ یعقوب، نگراں: محمد باقر خان خاکوانی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، پاکستان۔

۵۷۔ سیرۃ النبیؐ از شبلی نعمانی و ندوی میں مطالعہ ادیان کے مباحث: تجزیاتی مطالعہ، مقالہ نگار: اظہر حسین، نگراں: پروفیسر عاصم نعیم، ادارہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب لاہور، ۲۰۲۳ء۔

۵۸۔ سیرۃ النبی اور اصح السیر (مولانا شبلی نعمانی / سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالرؤف داناپوری) کے کلامی مباحث کا تحقیقی و تقابلی مطالعہ۔ مقالہ نگار: ہدایت علی رانا، نگراں: ڈاکٹر شبیر احمد منصوری، کلیہ عربی و علوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، صفحات: ۳۸۲۔

۵۹۔ سیرۃ النبیؐ اور رحمۃ للعالمین کی روشنی میں دلائل النبوۃ کا تقابلی جائزہ۔ مقالہ نگار: ولی اللہ،

نگراں: ڈاکٹر نائلہ صفدر، شعبہ علوم اسلامیہ ،Gabriel کالج ، منڈی بہاء الدین، جی سی یونیورسٹی لاہور۔ ۲۰۱۴ء۔

۶۰۔ سیرۃ النبیؐ اور سیرۃ المصطفیٰ کا تحقیقی اور تقابلی جائزہ۔ مقالہ نگار: رضیہ نور، نگراں: ڈاکٹر ابوالوفا محمود، شیخ زاید اسلامک سینٹر، یونیورسٹی آف لاہور۔ ۲۰۰۸ء۔

۶۱۔ سیرۃ النبی شبلی ر سلیمان، اصح السیر عبدالرؤف داناپوری اور سیرۃ المصطفیٰ کاندھلوی کا خصوصی مطالعہ۔ مقالہ نگار: ثوبیہ بخاری، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی آف فیصل آباد، فیصل آباد، پاکستان۔

۶۲۔ شبلی بحیثیت سیرت نگار الفاروق کے تناظر میں۔ مقالہ نگار: ڈاکٹر مشتاق احمد قادری (بقیہ تفصیلات دستیاب نہیں)۔ یہ مقالہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا ہے، مگر اس میں بھی سوائے اس کے کہ یہ ایم فل کا مقالہ ہے کسی قسم کی تفصیل درج نہیں ہے۔

۶۳۔ شبلی کی تصانیف میں سوانحی اور تاریخی عناصر۔ مقالہ نگار: زاہد حسین میر، نگراں: ڈاکٹر الطاف حسین، شعبہ اردو، اسکول آف لینگویجز، سینٹرل یونیورسٹی کشمیر۔ ۲۰۱۹ء۔

۶۴۔ شبلی کی تنقیدی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ۔ مقالہ نگار: محمد عمر فاروق اعظم، نگراں: پروفیسر عتیق اللہ، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

۶۵۔ شبلی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ۔ مقالہ نگار: فیضان احمد (جیراج پور)، نگراں: ڈاکٹر مظہر حسین، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ ۱۹۹۸ء۔

۶۶۔ شبلی کی شعری لفظیات (کلیات شبلی کے حوالے سے)۔ مقالہ نگار: احمد کلیم، نگراں: پروفیسر خالد سعید، شعبہ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، ۲۰۱۳ء۔

۶۷۔ شبلی کی مکتوب نگاری: ایک تجزیاتی مطالعہ۔ مقالہ نگار: شاداب عالم، نگراں: ڈاکٹر ایس ایم عباس، شعبۂ اردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء۔

۶۸۔ شبلی نعمانی اور اقبال۔ مقالہ نگار: شکیل احمد چودھری، نگراں: پروفیسر اختر پرویز، شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔ ۲۰۰۳ء۔

۶۹۔ شبلی نعمانی کے تنقیدی ماخذ۔ مقالہ نگار: ثمینہ شہناز، نگراں: ڈاکٹر جمیل اصغر، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد۔

۷۰۔ شذرات شبلی: ایک تنقیدی جائزہ۔ مقالہ نگار: عبدالرحمن اعظمی، نگراں: پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

۷۱۔ غزوات نبوی: شبلی، سلیمان منصورپوری اور مبارکپوری کا خصوصی مطالعہ۔ مقالہ نگار: صدف عنبریں بٹ، نگراں: ڈاکٹر رضیہ شبانہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

۷۲۔ مطالعۂ استشراق اور علامہ شبلی نعمانی: تحقیقی مطالعہ۔ مقالہ نگار: زیب الایمان، نگراں: مستفیض احمد علوی۔ شعبہ علوم اسلامیہ، جی-ایچ-ٹی یونیورسٹی گجرانوالہ، پاکستان۔

۷۳۔ مقالات شبلی جلد چہارم کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ۔ مقالہ نگار: شائستہ نگار۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔ ۲۰۰۳ء۔

۷۴۔ موازنہ انیس و دبیر کا تجزیاتی مطالعہ۔ مقالہ نگار: ارشاد احمد خاں، نگراں: پروفیسر شارب ردولوی، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی۔ یہ مقالہ "موازنہ انیس و دبیر، مطالعہ، محاسبہ، تقابل" کے نام سے ۲۰۰۰ء میں دہلی سے شائع ہوا۔

۷۵۔ موازنہ انیس و دبیر کا تنقیدی جائزہ۔ مقالہ نگار: سہیل اختر، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۱۹۹۵ء، صفحات: ۲۹۳۔

۷۶۔ مولانا شبلی نعمانی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی سوانح نگاری کا تقابلی جائزہ بحوالہ امام ابو حنیفہ۔ مقالہ نگار: محمد عبد اللہ، نگراں: ڈاکٹر نورالدین جامی، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان۔ ۲۰۱۲-۲۰۱۰ء۔

۷۷۔ مولانا شبلی نعمانی اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے اصول سیرت نگاری کا تحقیقی و تقابلی جائزہ۔ مقالہ نگار: محمد حامد رضا، نگراں: ڈاکٹر عبد القدوس صہیب، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان۔ ۲۰۱۳-۲۰۱۱ء۔

۷۸۔ مولانا شبلی نعمانی کی سیرت نگاری پر ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے نقد کا تحقیقی جائزہ۔ مقالہ نگار: حافظہ ماریہ جبیں، نگراں: ڈاکٹر رضیہ شبانہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

۷۹۔ مولانا شبلی نعمانی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ مقالہ نگار: حافظ قاری محامد ہلال اعظمی قاسمی، نگراں: پروفیسر ڈاکٹر مظفر علی شہ میری، شعبہ ردو، حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی۔ یہ مقالہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔

ایم اے، اور ایم ایس:

۸۰۔ اشاریہ الفاروق: سوانح عمری حضرت عمر فاروقؓ۔ مقالہ نگار: شمیم بانو، نگراں: ڈاکٹر ہلال نقوی، کراچی یونیورسٹی، کراچی۔

۸۱۔ الاتجاہ النقدی فی فکر شبلی النعمانی (عربی)، مقالہ نگار: شاہ محمد حماد، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد۔

۸۲۔ الفاروق از شبلی نعمانی اور الفاروق "عمر" از محمد حسین ہیکل: ایک جائزہ۔ مقالہ نگار: اسا نور، نگراں: محمد عبد اللہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۸۳۔ شبلی نعمانی بحیثیت متکلم اسلام۔ مقالہ نگار: ارم گل، نگراں: محمد اکرم رانا۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، پاکستان۔

۸۴۔ علامہ شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار۔ مقالہ نگار: میاں سرفراز حسین کپاہی، نگراں: محمد شفقت اللہ، شعبہ علوم اسلامیہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان۔ ۱۹۸۹-۱۹۸۷ء۔

۸۵۔ علامہ شبلی نعمانی کی دینی خدمات۔ مقالہ نگار: فرزانہ ملک، نگراں: ڈاکٹر سید عابد احمد علی۔ ادارہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۶ء۔

بی اے:

۸۶۔ مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں۔ مقالہ نگار: عبد اللطیف اعظمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۹۴۱ء۔ یہ مقالہ مئی ۱۹۴۵ء میں شبلی اکادمی، قرول باغ نئی دہلی سے شائع ہوا۔

۸۷۔ الفاروق از شبلی نعمانی اور الفاروق الاعظمؓ از محمد حسین ہیکل کا تقابلی جائزہ۔ مقالہ نگار: علی حسن چودھری، نگراں: حافظ محمد نعیم، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور۔

تحقیقی مقالات کی اس فہرست سے واضح ہوتا ہے کہ جامعات میں علامہ شبلی کی سیرت و شخصیت فکر و فن اور ان کے عظیم الشان علمی و ادبی کارناموں پر محققین کی خاص توجہ رہی ہے۔ اس میں اگرچہ علامہ شبلی کی ہمہ جہت شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں ہو سکا ہے، تاہم اہم اور بنیادی موضوعات شبلی پر محققین نے داد تحقیق ضرور دی ہے۔ مثلاً علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، تعلیمی اور سوانحی خدمات پر نسبتاً زیادہ مقالات سپردِ قلم کئے گئے ہیں۔ تصانیف میں موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم، الفاروق، مکاتیب، مقالات اور سیرۃ النبی وغیرہ پر مستقل اور بعض کتب و موضوعات پر کئی کئی مقالات لکھے گئے ہیں۔ حالی و شبلی، ادریس کاندھلوی، داناپوری، نور بخش توکلی وغیرہم کی سیرت کی کتابوں اور ان کے بعض ضمنی مباحث سے موازنہ و تقابل بھی کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی کی تاریخ نویسی، تنقید نگاری، سوانح نگاری، سیرت نگاری، شاعری اور نظریۂ شعر و شاعری پر بھی تحقیقی مقالات لکھے گئے ہیں۔ مستشرقین کے حوالے سے بھی ایک مقالہ لکھا گیا ہے۔ لیکن مطالعات شبلی کے ابھی کئی اور اہم موضوعات پر تحقیق و تدقیق کا کام باقی ہے اور محققین کی توجہ کا منتظر ہے۔ مثلاً علامہ شبلی ایک فلسفی بھی تھے۔ انھوں نے فلسفہ اور فلسفہ کے مختلف پہلوؤں پر نہایت گراں مایہ مقالات لکھے ہیں جو مقالات شبلی کی ایک جلد (ہفتم) میں یکجا کئے گئے ہیں۔ اسی طرح ان کے سفر نامہ "روم و مصر و شام" اور منسوباتی تحقیق جن کی بہترین مثالیں سوانح مولانا روم، الغزالی، الانتقاد اور بعض مقالات ہیں۔ ان موضوعات پر بھی اب تک کوئی مستقل محققانہ مقالہ نہیں لکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس فہرست کی اشاعت سے اہل علم اور محققین شبلی کو نئے موضوعات پر داد تحقیق و تدقیق دینے میں آسانی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی علمی خدمات

ڈاکٹر محمد شاکر رضا

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

shakir.efl@gmail.com

علوم اسلامیہ کے بلند پایہ عالم، محقق، مترجم قرآن، مشہور سیرت نگار اور بین الاقوامی قانون کے ماہر ڈاکٹر محمد حمید اللہ ۱۶ محرم ۱۳۲۶ھ بمطابق ۱۹ فروری ۱۹۰۸ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق حیدرآباد دکن کے ایک شریف اور معزز خاندان سے تھا۔ آپ کا خاندانی نسب نوائط سے جا کر ملتا ہے جو اصلاً عربی النسل مسلمان تھے اور جنوبی ہند کے حکمراں سلطان علاء الدین حسن بہمنی (مدت حکومت: ۱۳۴۷-۱۳۵۸ء) کے زمانے میں عراق کے شہر بصرہ سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے ہندوستان کے مغربی علاقوں میں سکونت اختیار کی، پھر رفتہ رفتہ جنوبی ہند کے دیگر علاقوں میں سکونت پذیر ہوئے۔ جنوبی ہند کے بہمنی، عادل شاہی، نظام شاہی اور دیگر حکومتوں کے سلاطین نے اپنے اپنے زمانے میں نوائطی عربوں کو نہ صرف اعزاز و اکرام سے نوازا بلکہ انھیں بڑے عہدوں پر فائز بھی کیا۔[۱]

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے جد اعلیٰ مولانا محمد غوث ناصر الدین کا شمار بڑے علماء میں ہوتا تھا، ارکاٹ[۲] کے نواب عظیم الدولہ (۱۷۷۵-۱۸۱۹ء) نے انہیں ''شرف الملک خان بہادر خان غالب جنگ'' کے خطاب سے نوازا تھا۔ مولانا محمد غوث نے عربی اور فارسی میں متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں ''نثر المرجان فی رسم نظم القرآن'' ان کی سب سے اہم کتاب شمار کی جاتی ہے جو سات جلدوں پر مشتمل ہے اور مجلس اشاعت العلوم حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے دادا محمد صبغت اللہ

---

[۱] ڈاکٹر محمد سلطان محی الدین، علماء العربية ومساهماتهم في الأدب العربي في العهد الآصفجاهي، ابو الوفاء افغانی پرنٹنگ پریس، جامعہ نظامیہ حیدرآباد، ۲۰۰۵ء، ص ۲۹۳

[۲] ارکاٹ (Arcot) ہندوستانی ریاست تامل ناڈو میں چنائی کے قریب کچھ علاقوں کو کہا جاتا ہے جہاں پہلے ایک نوابی ریاست تھی۔

قاضی بدر الدولہ ارکاٹ کے قاضی القضاۃ، صدر الصدور، مفتی اور بلند پایہ مصنف تھے۔ انہوں نے عربی، اردو اور فارسی میں متعدد کتابیں لکھیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے والد ابو محمد خلیل اللہ بھی عربی اردو اور فارسی کے جید عالم تھے۔ وہ مدراس میں مسلمانوں کے زوال کے بعد حیدرآباد دکن منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے مختلف عہدوں پر کام کیا[۳]۔

تعلیم و تربیت: ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ایک علمی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والدین اور اپنی بڑی بہن سے حاصل کی، باقاعدہ تعلیم کے لیے آپ کو شہر کے اس وقت کی مشہور درسگاہ مدرسہ دار العلوم میں داخل کیا گیا جہاں آپ نے اردو مڈل (جماعت ششم) تک کی تعلیم حاصل کی۔ عربی تعلیم اور معقولات و منقولات کے لیے آپ کو جامعہ نظامیہ حیدرآباد میں داخل کرایا گیا، یہاں آپ نے مولوی سے کامل تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے ۱۹۲۳ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبۂ دینیات سے ایم اے اور اس کے لا کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ عثمانیہ ہی میں انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے "اسلامی قانون بین الممالک" کے موضوع پر تحقیق کا عمل شروع کیا۔ اس ریسرچ پروجیکٹ کو مکمل کرنے کے لیے آپ نے لندن، اٹلی، حجاز، لبنان، شام، فلسطین، مصر اور ترکی کا سفر کیا اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ انہوں نے جامعہ عثمانیہ کی اجازت سے اپنا تحقیقی مقالہ جرمن زبان میں بون یونیورسٹی جرمنی میں پیش کیا جس پر انہیں جولائی ۱۹۳۳ء میں ڈی فل کی ڈگری سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی علمی تشنگی انہیں کھینچ کر جرمنی سے فرانس لائی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک اور ڈگری کے لیے سوربون یونیورسٹی پیرس میں داخلہ لیا۔ یہاں انہوں نے "عہد نبوی اور خلافتِ راشدہ میں اسلامی سفارت کاری" کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ فرانسیسی زبان میں پیش کیا جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی[۴]۔

حیات و خدمات: جرمنی اور فرانس سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر محمد حمید اللہ ۱۹۳۵ء میں حیدرآباد واپس آ گئے۔ اسی سال آپ کو جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات میں لکچرر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ بعد میں جامعہ عثمانیہ کے لا کالج میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر آپ کی

---

[۳]۔ محمد احتشام الدین خرم، ڈاکٹر محمد حمید اللہ: حیات اور ادبی خدمات، یوسف شرف الدین ادبی و مذہبی ٹرسٹ، حیدرآباد دکن، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴-۱۵۔

[۴]۔ علماء العربیہ ص ۲۹۵۔

تقرری ہوئی جہاں آپ نے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۸ء تک محنت اور تندہی سے اپنی تدریسی خدمات پیش کیں اور بے شمار طلبا نے آپ کی قانون دانی سے استفادہ کیا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی تو نظام میر عثمان علی خان نے ریاست حیدرآباد کو ہندوستان میں ضم کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے ریاست کی خود مختاری کے لیے اقوام متحدہ میں اپنا مقدمہ پیش کیا۔ اس کے لیے انہوں نے ایک وفد تشکیل دے کر روانہ کیا۔ اس وفد میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھی شامل تھے۔ ابھی یہ وفد پیرس ہی میں تھا کہ اسی دوران ریاست حیدرآباد کا ہندوستان سے ستمبر ۱۹۴۸ء میں انضمام عمل میں آگیا۔ بدلے ہوئے حالات میں نظام حیدرآباد نے اس وفد کو واپس بلا لیا۔ وفد کے سارے ارکان واپس آگئے لیکن ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے واپس آنے سے انکار کر دیا، اور وطن سے دور پیرس میں ہی رہنا پسند کیا۔

برسوں پہلے وہ علم کی تلاش میں پیرس آئے تھے اور اب ۱۹۴۸ء میں پیرس کے ہو کر رہ گئے۔ وہاں آپ بیس سال تک پیرس کے نیشنل سینٹر آف سائنٹیفک ریسرچ سے وابستہ رہے، آپ نے فرانس، جرمنی، ترکی اور دیگر ملکوں کی جامعات میں مسلسل توسیعی لیکچرز بھی دیے۔ آپ کو اردو، عربی، ترکی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں مہارت تھی اور ان زبانوں میں آپ نے کتابیں اور مقالات بھی لکھے۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں پاکستان سمیت کئی ملکوں نے آپ کو انعام واکرام سے نوازا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ پیرس میں نصف صدی سے زیادہ سکونت پذیر رہے۔ انہیں سادگی اور بے نیازی کی زندگی پسند تھی۔ وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تنہا رہتے تھے جس میں بس دو کمرے تھے۔ ایک میں چاروں طرف کتابیں ہوتی تھیں، اور دوسرا کمرہ ملاقاتیوں کے لیے خاص تھا۔ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ بھی تھا جس میں وہ خود ہی کھانا تیار کرتے۔ علوم وفنون کی تلاش و جستجو میں آپ اس قدر گم تھے کہ آپ کو کبھی شادی کی فکر بھی نہ ہوئی۔ عمر کے آخری ایام میں آپ مسلسل بیمار رہنے لگے اور آپ کو اسپتال میں داخل کیا گیا۔ آپ کی ایک بھتیجی سدیدہ عطاء اللہ امریکہ میں مقیم تھیں۔ وہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو اپنے ساتھ امریکہ لے گئیں۔ ۹۴ سال کی عمر میں امریکہ ہی میں ۱۷ دسمبر ۲۰۰۲ کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ اس طرح آسمانی سورج کے مانند مشرق کا یہ علمی سورج خاموشی سے مغرب میں غروب ہو گیا[۵]۔

---

[۵] ۔ علماء العربیہ ، ص ۲۹۵-۲۹۶؛ ڈاکٹر محمد حمید اللہ: حیات اور ادبی خدمات، صفحات ۲۴-۳۶

مطالعات اسلامی میں خدمات: ڈاکٹر محمد حمید اللہ ممتاز محقق، مفکر اور علوم اسلامیہ کے ماہر تھے۔ ساتھ ہی وہ اردو، عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی، اور جرمن زبانوں کے بھی ماہر تھے۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا، سرعت تحریر میں ان کا جواب نہ تھا۔ قران کریم، حدیث نبوی، اور سیرت کے موضوع پر مختلف زبانوں میں انہوں نے سینکڑوں کتابیں اور مقالات لکھے۔ ان کا سب سے عظیم کارنامہ فرانسیسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ اتنا مقبول ہوا کہ اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مختلف عالمی زبانوں میں قرآن کریم کے جو ترجمے ہوئے ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی کتاب "القرآن فی کل لسان" میں ان کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے بطور نمونہ ان تمام عالمی زبانوں میں سورہ فاتحہ کا ترجمہ بھی پیش کر دیا ہے۔ سب سے پہلے یہ کتاب حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت انہوں نے ۲۳ عالمی زبانوں میں ترجمۂ قرآن کی تفصیل پیش کی تھی۔ بعد میں یہ تعداد بڑھ کر ایک سو پچاس ہو گئی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے عربی، اردو، ترکی اور فرانسیسی مجلات ورسائل میں بھی قرآن کریم کے ان ترجموں کی تفصیلات پر گراں قدر مقالے لکھے[۶]۔

صَحِيفَةُ هَمَّامِ بْنِ مُنَبِّهٍ حدیث کا قدیم ترین مجموعہ ہے۔ اس صحیفے کو ہمام بن منبہ نے صحابی رسول حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (متوفی ۵۸ ہجری) سے نقل کیا تھا۔ گویا اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے اٹھاون سال کے اندر اندر حضرت ابو ہریرہ کی وفات سے پہلے ضبط تحریر میں لایا گیا تھا۔ لیکن عرصۂ دراز تک یہ صحیفہ مفقود تھا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو اس صحیفے کا ایک نسخہ زمانۂ طالب علمی میں برلن (جرمنی) میں ملا۔ پھر ان کو اس کا دوسرا نسخہ دمشق میں ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے دونوں نسخوں کو پیش نظر رکھ کر اس بے حد اہم مجموعے کو پہلی بار ایڈٹ کر کے اپنی تعلیقات کے ساتھ شائع کیا۔ انہوں نے اس مجموعے کے شروع میں تدوین حدیث اور عہد نبوی میں حدیث کی تدوین کے سلسلے میں ایک گراں قدر مقدمہ لکھا۔ اس مقدمے میں انہوں نے مستشرقین اور منکرین حدیث کے اس زعم کا بھی رد کیا کہ چوں کہ حدیث کی تدوین کا کام دوسری یا تیسری صدی ہجری میں انجام پایا اس لیے حدیث پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے دلیلوں سے ثابت کیا کہ احادیث نبویہ کی تدوین خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں شروع ہو چکی تھی اور بعض صحابہ کرام احادیث کو لکھا کرتے تھے۔ ان ہی میں حضرت ابوہریرہ

---

[۶] ۔ سید عبد الماجد الغوری، محمد حمید اللہ سفیر الاسلام وأمین التراث الاسلامی فی الغرب، دار ابن کثیر، دمشق، بیروت ۲۰۰۹ء، ص: ۱۴۱۔۱۴۲۔

رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے احادیث شریفہ کے اس مجموعے کو اپنے شاگرد خاص ابو عقبہ ہمام بن منبہ کے لیے "الصحيفة الصحيحة" نام سے مرتب فرمایا جو بعد میں صحيفة همام بن مُنَبِّه کے نام سے مشہور ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس مقدمہ کو سب سے پہلے المجمع العلمي العربی، دمشق نے ۱۹۵۳ء میں "صحيفة همام بن منبه ومكانتها في تأريخ علم الحديث" کے نام سے اپنے گراں قدر میگزین کے تین شماروں میں مقالے کی صورت میں قسط وار شائع کیا، پھر اسی سال مجمع نے اس مقدمے کو صحيفة همام بن مُنَبِّه کے ساتھ أقدم تدوين في الحديث النبوی، صحيفة همام بن منبه المؤلفة قبل سنة ۵۸ للهجرة (صحيفة هَمّام بن مُنَبِّه حدیث نبوی کی قدیم ترین تدوین ہے، جسے سن ۵۸ ہجری سے پہلے لکھا گیا) کے نام سے دوبارہ شائع کیا۔ حدیث کے اس قدیم ترین مجموعے کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ اس میں بیان کی گئیں ساری احادیث کو جن کی تعداد ایک سو اڑتیس ہیں، امام احمد نے اپنی کتاب مسند کی دوسری جلد میں صفحہ ۳۱۲ سے صفحہ ۳۱۹ کے درمیان سلسلہ وار نقل کیا ہے۔ امام بخاری نے بخاری شریف میں اس صحیفے کی بہت ساری احادیث کو الگ الگ ابواب کے تحت بیان کیا ہے(۷)۔

فرانسیسی زبان میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر *Le Prophete De Islam* (پیغمبر اسلام) کے نام سے آپ نے دو جلدوں میں کتاب لکھی۔ پروفیسر خالد پرویز نے اس کتاب کا "پیغمبر اسلام" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا ہے جو ملی پبلی کیشنز نئی دلی سے شائع ہوئی ہے اور تقریباً ساڑھے چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو اکیاون ابواب پر تقسیم کیا ہے، اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ان تمام مقامات اور مشاہد کا معائنہ کیا جن کا سیرت طیبہ میں ذکر آتا ہے اور انہوں نے ان کے نقشے بھی بر سر موقع تیار کرائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے فرامین و معاہدات اور وثیقہ جات کو جمع کرنے کا کام بھی انجام دیا۔ پہلے انہوں نے ان سیاسی رسائل اور وثیقہ جات کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا، اور ان کی تاریخی قدر و قیمت پر سیر حاصل گفتگو کی، جس سے اس دور کی سیاسی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فرانسیسی زبان میں ان کے اس

---

(۷) تفصیل کے لیے دیکھیے: صحيفة همام بن منبه، تحقیق: ڈاکٹر محمد حمید اللہ، المجمع العلمي العربی، دمشق، ۱۹۵۳ء، ص ۲۰

گراں قدر مقالہ پر ۱۹۳۵ء میں فرانس کی سوربون یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے تلاش و جستجو کر کے ان رسائل اور وثیقہ جات میں بہت سارے اضافہ کیے اور ان کو اصل عربی نصوص کے ساتھ، ”مجموعة الوثائق السياسية للعهد النبوي والخلافة الراشدة“ کے نام سے ۱۹۴۱ء میں قاہرہ سے کتابی شکل میں شائع کیا، پھر دار النفائس بیروت سے اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کتاب میں ساڑھے سات سو سے زیادہ صفحات اور ۳۷۴ وثیقہ جات، فرامین، دستاویزات، معاہدے، اور مکتوبات ہیں، ان میں بعض احکام و فرامین حدیث نبوی کے ذخائر سے نکالے گئے ہیں، اور اکثر کتب سیر میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے پہلے بھی بعض علماء و محققین نے تلاش کر کے ایسے مجموعے شائع کیے ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس صنف کو جامعیت کا درجہ بخشا، انہوں نے اسے تدوین کرنے میں غیر معمولی مشقتیں اٹھائیں، رسائل و فرامین کی تلاش میں ترکی، مصر، فرانس اور انگلینڈ کے کتب خانوں کے چکر لگائے تب جا کر یہ گوہر نایاب ہم تک پہنچا۔ مؤلف نے اس مجموعہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ عہد نبوی کے معاہدات کے بارے میں ہے، جب کہ دوسرا حصہ عہد خلفائے راشدین کے معاہدات کے بارے میں ہے۔ دونوں کے متعلق سیاسی اور جغرافیائی حیثیت کے ضمیمے اور نقشے بھی کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر مولانا ابویحیی امام خان نوشروی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا جو پہلی بار ۱۹۶۰ء میں مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

سیرت کے موضوع پر سب سے پہلی مدون کتاب ”سیرۃ ابن اسحاق“ ہے۔ ابن اسحاق (۷۰۴ء-۷۶۸ء) کی اس کتاب سے ان تمام لوگوں نے استفادہ کیا ہے جنہوں نے ان کے بعد سیرت کے موضوع پر لکھا ہے۔ لیکن یہ کتاب مفقود تھی، البتہ اس کے بعد لکھی جانے والی کتاب ”سیرۃ ابن ہشام“ کو شہرت دوام حاصل ہوئی جو دراصل ”سیرۃ ابن اسحاق“ کی تلخیص و تہذیب ہے۔ ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء) نے ابن اسحاق کی کتاب میں بہت سارے حذف و اضافے کیے۔ سیرۃ ابن ہشام علماء و اسکالرز کے درمیان سیرت کی سب سے اہم اور مستند کتاب شمار کی جاتی ہے۔ اسے اس قدر قبولیت ملی کہ لوگ سیرۃ ابن اسحاق کو بھول گئے، اور پھر دھیرے دھیرے سیرۃ ابن اسحاق ناپید ہوتی گئی یہاں تک کہ اس کا ایک بھی مکمل نسخہ دنیا میں موجود نہ رہا۔ ابن اسحاق کی کتاب سے غفلت برتنے کے دو اہم سبب بیان کیے جاتے ہیں، اول یہ کہ ابن ہشام نے اپنی وسعت علم و دقت نظر کے باوجود ابن اسحاق کی کتاب کے کچھ مضامین کو حذف کر دیا۔ دوم یہ کہ ابن اسحاق کی کتاب میں کثیر تعداد میں ایسے اشعار تھے جنہیں

ابن ہشام نے اس بنیاد پر حذف کر دیا کہ جن شاعروں کی طرف یہ اشعار منسوب تھے ان کی طرف ان اشعار کی نسبت صحیح نہیں ہے۔

اہل علم سیرۃ ابن اسحاق سے واقف تو تھے لیکن اصل کتاب تک ان کی رسائی ممکن نہ تھی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے تلاش بسیار کے بعد پہلی بار مراکش سے اصل کتاب کے کچھ اجزاء برآمد کر کے اسے تحقیق اور تعلیق کے ساتھ شائع کیا۔ ابن ہشام نے جن باتوں کو اپنی کتاب میں شامل کرنا ضروری نہ سمجھا تھا، ان باتوں کے لیے ابن اسحاق کا یہ نسخہ ایک اہم مصدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیرت کے موضوع پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی یہ خدمت ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ سیرت ابن اسحاق کے اس تحقیق شدہ نسخے کا اردو ترجمہ نور الٰہی ایڈووکیٹ نے کیا ہے جو ملی پبلی کیشنز نئی دہلی سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی عالمی شہرت یافتہ کتاب انگریزی زبان میں *Introduction to Islam* ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے پیغمبر اسلام، ان کی حقیقی تعلیمات کا تحفظ، اسلام کا نظریۂ زندگی، عقیدہ اور ایمان، اسلامی زندگی اور عبادات، اسلام اور روحانیت، اسلام کا نظام اخلاقیات، اسلام کا سیاسی نظام، اسلام کا عدالتی نظام، اسلام کا معاشی نظام، مسلمان عورت، اسلام میں غیر مسلموں کی حیثیت، علوم وفنون کی ترقی میں مسلمانوں کی خدمات، اسلام کی عمومی تاریخ، مسلمانوں کی روزمرہ زندگی اور اس طرح کے پندرہ اہم موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ بعض ممالک میں اس کتاب کو نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے، متعدد زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ بھی ہوا ہے، خود اردو زبان میں اس کے دو ترجمے میرے پیش نظر ہیں۔ ایک ترجمہ سید خالد جاوید مشہدی نے کیا ہے۔ اس کو "اسلام کیا ہے؟" کے عنوان سے البلاغ پبلی کیشنز نئی دہلی نے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا ہے۔ اسی کتاب کا ایک اور اردو ترجمہ پروفیسر خالد پرویز نے "داعی اسلام" کے نام سے کیا ہے جو ملی پبلی کیشنز نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ ترجمے کا دوسرا ایڈیشن میرے پیش نظر ہے جو ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ مسلکاً شافعی تھے، لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا وہ بے حد احترام کرتے تھے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: "امام شافعی کے دادا استاذ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی میرے دل میں بڑی عزت ہے: بطور انسان اور مسلمان کے بھی اور بطور عالم اور فقیہ کے بھی"[۸]۔ اسی احترام کے پیش نظر ڈاکٹر محمد حمید

---

[۸] محمد حمید اللہ، امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون اسلامی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۸۳ء، ص ۱۴

اللہ نے امام ابو حنیفہ پر ایک معلومات آفریں کتاب ''امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون اسلامی'' لکھی ہے جو بظاہر ایک چھوٹے حجم کی کتاب ہے، لیکن تحقیق و تدقیق کے نکتہ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے، کیوں کہ خود صاحب کتاب یوروپی اور بین المالکی قانون کے ساتھ اسلامی قانون کے ماہر بھی تھے جس نے کتاب کی قدر و قیمت کو اور بڑھادیا ہے۔ علمی میدان میں امام ابو حنیفہ کی جو خدمات ہیں اس کی نظیر کہیں مشکل سے ملتی ہے۔ آپ نے شہر کوفہ میں ایک مجلس شوری کی بنیاد ڈالی۔ اس مجلس کا کام کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور واقعات و حقائق کی روشنی میں اسلامی قانون سازی تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہر مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو جانچا جاتا اور تحقیق و تدقیق کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک کہ اتفاق رائے نہ ہو جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک ہی مسئلہ کی جانچ میں کئی ہفتے اور مہینے گزر جاتے۔ امام ابو حنیفہ کی زندگی کے پورے تیس سال اسی عمل میں گزرے۔ تدوین قانون اسلامی کے ایسے ہی مختلف پہلوؤں کی تفصیلات کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کی ہے۔ قانون اسلامی پر جو اعتراضات مخالفین کرتے آئے ہیں ان پر بھی ڈاکٹر صاحب نے تفصیلی بحث کی ہے، بالخصوص اس معاملے پر کہ قانون اسلام پر رومی قانون کا اثر پڑا یا نہیں، مصنف نے جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن ترمیم واضافے کے ساتھ حیدرآباد دکن سے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۶۵ء کے درمیان شائع ہوئے، پھر اردو اکیڈمی، سندھ کراچی نے اسے چھٹی بار ۱۹۸۳ء میں شائع کیا، جو ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

''خطبات بہاولپور'' ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے ان بارہ خطبات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۸۔ ۲۰ مارچ ۱۹۸۰ء کے درمیان اسلامی یونیورسٹی بہاولپور پاکستان میں دیے تھے۔ ان خطبات کو ریکارڈ کر لیا گیا تھا اور اہل ذوق و طلب کے اصرار پر یونیورسٹی نے اردو، عربی اور اسلامیات کے اساتذہ کی نگرانی میں اس کی اشاعت کا کام انجام دیا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کتاب کی تیسری اشاعت کے وقت اس پر نظر ثانی کی، اور مراد کو سمجھنے میں جہاں دقت پیش آئی وہاں انہوں نے اصلاح بھی کر دی۔ یہ کتاب تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع کے چار خطبوں میں اسلام کے بنیادی مآخذ یعنی قرآن و حدیث اور فقہ و اجتہاد کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ پہلے خطبے میں قرآن کریم کی جمع و تدوین پر بیان ہے، اور قرآن کریم جس محفوظ صورت میں مسلمانوں تک پہنچا ہے اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس خطبے میں گزشتہ آسمانی کتابوں کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ دوسرے خطبے میں حدیث نبوی کی دینی اہمیت واضح کرنے کے بعد عہد نبوی کے تحریری سرمائے کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے خطبے میں فقہ اسلامی کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ اس میں فقہ اسلامی کی تشکیل، اس کی نشو و نما، امام ابو حنیفہ کے زمانے میں اس کی باقاعدہ تدوین اور اس کے اہم مآخذ و مصادر پر وضاحت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔ چوتھا خطبہ اصول فقہ و اجتہاد کی تاریخ پر

مشتمل ہے۔ اس خطبے میں اس بات کی وضاحت ہے کہ اسلامی قانون کی تدوین کس طرح عمل میں آئی، اور نئے مسائل کو کس طرح قرآن کریم وسنت نبوی کی روشنی میں حل کیا جاتا تھا۔ پانچواں خطبہ قانون بین الممالک پر ہے۔ اس میں دو ریاستوں کے باہمی تعلقات کے اصول و قوانین پر روشنی ڈالی ہے۔ چھٹا خطبہ دین پر ہے۔ اس میں حدیث جبرئیل کی روشنی میں عقائد و ایمانیات، اسلامی عبادات اور احسان وتصوف کی حقیقت واہمیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ آخر کے چھ خطبوں میں سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر فاضلانہ گفتگو کی گئی ہے، اس سلسلے کے پہلے خطبے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریاست کے نظم ونسق کا ذکر ہے۔ اس کے بعد دفاع وغزوات پر ایک مستقل خطبہ ہے۔ نویں خطبہ میں دور نبوت کے نظام تعلیم کا ذکر ہے۔ ایک خطبے میں عہد نبوی کے تشریعی نظام اور عدلیہ پر گفتگو کی گئی ہے۔ ایک اور خطبے میں مالی نظام اور تقویم پر بحث کی گئی ہے۔ آخری خطبے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ اسلام کے طریقے اور غیر مسلموں کے ساتھ آپ کی رواداری اور شریفانہ برتاؤ کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ خطبوں کے بعد ڈاکٹر صاحب سے سوالات کیے جاتے تھے اور وہ ان کے جوابات دیتے تھے۔ ہر خطبہ کے آخر میں یہ سوالات وجوابات بھی درج ہیں۔ ان موضوعات پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی گہری نظر تھی۔ یہ خطبے ان کے برسوں کے مطالعے کا نچوڑ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مختلف فقہی وفکری جماعتوں کے بارے میں بے حد معتدل رائے رکھتے تھے، اور مختلف فیہ مسائل میں اپنی رائے مسلط کرنے کے بجائے لوگوں کو ان کے مسلک پر عمل کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ البتہ بعض مسائل پر ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر دوسروں سے مختلف تھا جن کے نمونے قاری کو ان کی تحریروں میں ملتے ہیں۔

مصادر و مراجع

۱- ڈاکٹر محمد حمید اللہ، امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون اسلامی، اردو اکیڈمی، سندھ کراچی، ۱۹۸۳ء

۲- ڈاکٹر محمد حمید اللہ، Introduction to Islam ترجمہ: پروفیسر خالد پرویز، ملّی پبلی کیشنز نئی دلّی، ۲۰۱۵ء؛ ترجمہ: سید خالد جاوید مشہدی، البلاغ پبلی کیشنز نئی دہلی ۲۰۱۱ء

۳- ڈاکٹر محمد حمید اللہ، Le Prophete De Islam (پیغمبر اسلام)- ترجمہ: پروفیسر خالد پرویز، ملی پبلی کیشنز نئی دلّی

۴- ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خطبات بہاولپور- اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی ۲۰۱۲ء

۵- محمد احتشام الدین خرم، ڈاکٹر محمد حمید اللہ: حیات اور ادبی خدمات، مطبعہ: یوسف شرف الدین ادبی ومذہبی ٹرسٹ، ۲۰۰۹ء

۶-سیرت ابن اسحاق، تدوین و تحقیق: ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ترجمہ: نور الٰہی ایڈووکیٹ، ملی پبلی کیشنز نئی دلّی، ۲۰۰۰ء

۷-صحيفة همّام بن مُنَبّه، تحقیق و تعلیق: ڈاکٹر محمد حمید اللہ، المجمع العلمي العربي دمشق ۱۹۵۳ء

۸-ڈاکٹر محمد سلطان محی الدین، علماء العربية ومساهماتهم في الأدب العربي في العهد الآصفجاهي-ابوالوفاء افغانی پرنٹنگ پریس جامعہ نظامیہ حیدرآباد، ۲۰۰۵ء

۹-مجلہ التنویر، سالانہ تحقیقی مجلّہ، شعبہ عربی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ۲۰۰۴ء

۱۰-ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مجموعة الوثائق السياسية للعهد النبوي والخلافة الراشدة، دار النفائس بیروت، طبع سادس، ۱۹۸۷ء

۱۱-سید عبد الماجد الغوری، محمد حمید اللہ سفیر الاسلام وأمین التراث الاسلامی فی الغرب، دار ابن کثیر دمشق، بیروت ۲۰۰۹ء

مضمون نگاروں کے لئے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۵ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبروار لکھیں۔

۳۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۴۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (صرف اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ / صفحات۔

۵۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۶۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین ومقالات کو جگہ دی جائے گی۔

چودھویں صدی عیسوی میں کشمیر میں فارسی ادب، سید علی ہمدانی کے حوالے سے

ڈاکٹر یاور عباس میر

اسسٹنٹ پروفیسر (فارسی) پنجابی یونیورسٹی، پنجاب

miryawarabass@gmail.com

چودھویں صدی عیسوی، کشمیر میں فارسی زبان و ادب کے حوالے سے ایک ناقابل فراموش صدی ہے۔ اگرچہ فارسی زبان کشمیر کے اندر اس سے پہلے ہی وارد ہو چکی تھی اور مثل کبک پا خراماں خراماں پوری وادی میں سیر کرتے ہوئے خود کو مانوس کر چکی تھی لیکن ابھی وہ ارتقا کی مطلوبہ منزل سے کافی دور تھی۔ چودھویں صدی میں اسے شاہمیری خاندان کا سایۂ عاطفت ملا اور میر سید علی ہمدانی جیسے عظیم ولی خدا کا دستِ شفقت نصیب ہوا۔ شاہ ہمدان کی معیت میں فارس سے آنے والے علماء و سادات کی فصیح و بلیغ زبانیں میسر آئیں۔ وادی کشمیر کی جنت نشان اور دلکش سرزمین شعر و ادب اور علم و معرفت کے لئے پوری دنیا میں موزوں ترین سرزمیں ہے۔ یہاں کے آبشاروں میں وہ موزونیت اور قدرتی ساز موجود ہے جو شاعروں کی طبعیت کو شعر گوئی پر اکساتی ہے۔ کوہساروں، نیستانوں، وادیوں اور گلشن زاروں کا جمال انسان کے اندر چھپے جمال کو ظاہر ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ جمالِ فطرت کے ساتھ صحبت سے ہی ہزاروں پر جمال ادب پارے وجود میں آتے ہیں۔ یہ قدرتی حسن کا ہی اثر ہے کہ جس نے ہمیشہ سے ہی حُسن گویائی اور حُسن نطق کو مہمیز دی اور شاعر یہ کہنے پر مجبور ہوا:

کمال همنشین در من اثر کرد
وگرنه من همان خاکم که هستم

(میرے ہمنشیں کے کمال نے مجھ پر اثر کر دیا، ورنہ میں بھی وہی ادنیٰ سی مٹی ہوں)

ایک طرف کشمیر کا ادب پرور ماحول اور دوسری جانب شاہ ہمدان جیسے ادیب و شاعر، عالمِ دین و مبلغِ اسلام اور سخن نواز انسان کا وارد ہونا سونے پر سہاگا کے مترادف ہوا۔ انہوں نے مسلسل قلم و زبان کو حرکت میں رکھا اور اسلام کی تبلیغ نہایت ہی فصیح و بلیغ زبان میں کرتے رہے۔ چونکہ ان کا وسیلۂ اظہار فارسی زبان تھا، لہٰذا جتنا جتنا وہ تحریری و تقریری خدمات اسلام کے تئیں انجام دیتے رہے، اتنا ہی فارسی زبان کو کشمیر میں فروغ ملتا گیا۔ شاہ ہمدان جب وادی کشمیر میں داخل ہوئے تو ان

کی مصاحبت میں تقریباً سات سو سادات و علماء تھے یہ علماء جہاں ایک طرف مبلغ و مفسرِ اسلام تھے وہیں وہ فارسی زبان کے مدرس و معلم بھی قرار پائے۔ ان کے توسط سے فارسی زبان کو جس قدر عروج نصیب ہوا وہ نہ صرف کشمیر بلکہ فارسی زبان و ادب کی تاریخ میں بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

شاہِ ہمدان کی پرکشش شخصیت اور لامثال کردار نے شاہمیری خاندان کے بادشاہ قطب الدین کو بہت متاثر کیا۔ چنانچہ اس نے میر سید علی ہمدانی سے ملاقات کی۔ قطب الدین چونکہ خود ادبی ذوق سے سرشار تھا، لہذا اسے فارسی زبان و ادب کے ساتھ بھی ایک خاص تعلق پیدا ہوا۔

سلطان قطب الدین کے عہد میں فارسی زبان و ادب اور علم و فن ارتقا کی ابتدائی منزلیں کشمیر میں طے کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس نے اس قدر وسعت و گیرائی حاصل کی کہ کشمیری پنڈتوں نے بھی فارسی کو علمی و ادبی کاوشوں کے لئے اپنا وسیلۂ اظہار بنالیا۔ قطب الدین کے عہد تک وہ اس زبان میں مہارت پیدا کر چکے تھے۔ مندرجہ ذیل نمونے سے کشمیر میں فارسی کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ چند اشعار ایک کشمیری ہندو شاعر مہادیو شیوجی کی تخلیق کردہ منقبت سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے امیر خسرو کی پیروی میں لکھی ہے:

غضنفر چرم در بر بود شب شاہی کہ من دیدم		ھمان اصل مہیشر بود شب شاہی کہ من دیدم
ھلالش تاج بر سر بود شب شاہی کہ من دیدم[1]		اما از سوے چپ بنگر چو صد خورشید تابان تر

قطب الدین(۱۳۵۴-۱۳۷۳) شاہمیری خاندان کا ایک بادشاہ تھا جس کی حکومت چودھویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں قائم تھی۔ اس دور میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے ہمراہ فارس سے بہت سارے سادات کشمیر آئے اور اس کے بعد امیر کبیر کے فرزند کے ساتھ بھی تین سو سادات وارد کشمیر ہوئے۔ سید علی ہمدانی جب کشمیر سے رخصت ہوئے تو بہت سارے رفقا کو سلطان، اس کے خاندان کے افراد اور عوام کی تعلیم و تربیت کے لئے کشمیر میں ہی چھوڑ کر گئے۔ ظاہر ہے ان کی زبان فارسی تھی اور وہ فارسی میں ہی اپنے روزمرہ کے امور انجام دیتے تھے۔ اس کی وجہ سے وادی میں نہ صرف فارسی زبان کو مزید فروغ ملا بلکہ کشمیری زبان و ادب اور تہذیب و تمدن پر بھی فارسی نے نمایاں اثرات چھوڑے۔

چودھویں صدی عیسوی کے دوران کشمیر میں کئی فارسی شعرا اور ادیب پیدا ہوئے۔ اس دور کا حکمراں قطب الدین خود بھی ایک شاعر تھا اور علم و فن کی طرف اس کا کافی میلان تھا۔ خواجہ اعظم

---

[1] عبدالقادر سروری، کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، مجلس تحقیقات اردو، سرینگر کشمیر، ۱۹۶۸ء، ص ۴۱

دیدمری سلطان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "باوجود شغل ملکی، میل کمالات علمی بسیار داشت" وہ "قطب" تخلص کرتے تھے۔ نمونہ کے طور پر ان کی ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ای بگرد شمع رویت عالم پروانہ ای — وز لب شیرین تو شوریست در ہر خانہ ای

من بہ چندین آشنائی میخورم خون جگر — آشنا را حال اینست وای بر بیگانہ ای

قطب مسکین گر گناھی می کند عیبش مکن — عیب نبود گر گناھی می کند دیوانہ ای[۲]

اس نمونے سے زبان کی شستگی و بندش الفاظ اور ملائم جذبات کا اندازہ ہوتا ہے، جن کا صدور ایک حکمراں سے ہونا تعجب خیز ہے۔

سید علی ہمدانی کی کشمیر آمد کے وقت وادی میں اچھے شعرا کے موجود ہونے کے شواہد ملتے ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر سید محمد خاوری نے آپ کی آمد پر ایک تاریخی قطعہ کہا ہے:

میر سید علی شہ همدان

سیر اقلیم سبعہ کرد نکو

شد مشرف ز مقدمش کشمیر

اهل آن شهر ازو هدایت جو

سال تاریخ مقدم او را

یابی از مقدم شریف جو[۳]

جو سادات آپ نے کشمیر میں کشمیریوں کی تعلیم و تربیت کے لئے چھوڑے تھے ان میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں جو علم و فن میں مہارت رکھتے تھے: سید جلال الدین عطائی، مولانا احمد سید کمال الدین، سید جمال الدین محدث، سید کمال الدین ثانی، سید فیروز، سید محمد کاظم، سید رکن الدین، سید فخر الدین، سید محمد قرینی اور پیر حاجی قاری۔

آخر الذکر پیر حاجی، سلطان قطب الدین کے دارالعلوم کے صدر تھے جو فارسی کے شاعر بھی تھے، جب وہ قریب المرگ تھے تو اس وقت درج ذیل اشعار ان کے لب پر تھے:

زین جہاں رفتیم و دل برداشتیم

با جہانیاں را جہاں بگزاشتیم

---

(۲) پروفیسر شمس الدین، واقعات کشمیر، اردو ترجمہ: جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سنٹر، سرینگر کشمیر، ۲۰۰۱، ص ۶۱

(۳) خواجہ اعظم دیدمری، واقعات کشمیر، اردو ترجمہ خواجہ عبدالحمید یزدانی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۵، ص ۷۵

ایمنی جستیم از دست اجل
وا دریغا ما غلط پنداشتیم[۴]

خواجہ اعظم نے سید علی کا ذکر کرتے ہوئے اس عہد کے ایک مورخ قاضی ابراہیم کا ذکر کیا ہے:

''قاضی ابراهیم ولد حمید الدین کہ قریب بہ آن عہد بود تاریخ خود این معنی رانوشتہ۔۔۔۔''

ایک دو جگہ اور بھی خواجہ اعظم نے ان کا ذکر کیا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کشمیر کی قدیم فارسی تاریخ قاضی ابراہیم کی لکھی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صوفی کا خیال ہے کہ طبیب شہاب الدین ابن عبد الکریم کی کتاب ''شفاء الامراض'' کا تعلق بھی چودھویں صدی کے نصف دوم سے ہے۔ یہ تصنیف ۱۳۸۸ء کی ہے۔ اس کے ترقیمے کے شعر حسب ذیل ہیں:

بفضل خداوند و سعی شہاب
مرتب شد ابواب هذا الکتاب
ز هفت صد زیاده نود سال بود
دهم روز از ماه شوال بود

اس زمانے کے ایک اور شاعر سید محمد بیہقی المعروف میر بابا اویس فارسی کے ممتاز شعرا میں سے تھے اور زیادہ تر صوفیانہ شاعری کرتے تھے۔ ان کا کلام اب دستیاب نہیں ہے۔ پیر غلام حسن کے مطابق ان کا دیوان چالیس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ صاحبِ ''تاریخ حسن'' نے آپ کے درج ذیل اشعار نقل کئے ہیں:

بعد ازین ویس ترک گفت و شنود
کنج کوه عبادت و طاعت معبود
ز ما سوای تو آنکہ فارغ البالند
بعاملی نفروشند ذوق تنہائی
گناه ما ز عدم نیامدی وجود
وجود عفو تو، در عالم عدم می بود

مولانا احمد (ان کا پورا نام اصل کتاب پر درج نہیں ہے، وہاں فقط مولانا احمد لکھا ہے، ملاحظہ ہو واقعات کشمیر دیدمری، اردو ترجمہ از خواجہ حمید یزدانی صفحہ ۱۱۸) اس زمانے کے ایک اور شاعر تھے

---

[۴] خواجہ اعظم دیدمری، واقعات کشمیر، اردو ترجمہ خواجہ عبد الحمید یزدانی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۵، ص ۴۶

جنہوں نے سلطان سکندر کے مرنے پر مرثیہ لکھا[۵]۔ خواجہ اعظم ددمری نے ان کے مندرجہ ذیل اشعار نقل کئے ہیں:

کجا است شاہ سکندر کجا است میدانش
در انتظار ھلاکند گوی و چوگانش
عجب کہ دیدہ شود گل شگفتہ در گلزار
عجب کبک خرامد بناز در کہسار

سید علی ہمدانی کی کشمیر آمد: دیگر ممالک کے بہ نسبت ہندوستان میں لوگ روحانی پیشواؤں سے بہت متاثر اور ان کے معتقد رہے ہیں۔ لہذا یہ بھی ایک وجہ رہی ہوگی جس کی بنا پر مختلف ممالک کے علماء و مذہبی رہنماؤں نے سرزمین ہندوستان کا رخ کیا۔ ان میں سے ایک میر سید علی ہمدانی جیسی عظیم المرتبت شخصیت، عارف باللہ و سالک الی اللہ چودھویں صدی عیسوی میں فارس سے کشمیر تشریف لائے اور خاص و عام کے لئے مظہر ہدایت قرار پائے۔

سید علی ہمدانی ۲۲/ اکتوبر ۱۳۱۴ء میں ایران کے ایک شہر ہمدان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید شہاب الدین ہمدان کے والی تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت علی علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ انہوں نے اپنے بیشتر اشعار میں "علائی" تخلص استعمال کیا ہے لیکن ان کی شہرت امیر کبیر یا شاہ ہمدان کے نام سے ہوئی۔ کشمیر میں وہ شاہ ہمدان کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ والدین نے ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ہر چیز مہیا کی۔ وہ اپنے والد کے بجائے اپنے ماموں سے متاثر تھے جو ایک اعلیٰ پایہ کے صوفی تھے۔ انہوں نے اپنے خاندان میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد چھ سال تک شیخ رکن الدین کی خدمت میں رہ کر کسب فیض کیا۔ کلام پاک حفظ تھا۔ اپنی بہترین فطری صلاحیت و استعداد کی وجہ سے انہوں نے اُس زمانے کے علوم خصوصاً مذہبی علوم میں مہارت حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت سیر و سیاحت کے باوجود تصنیف و تالیف میں صرف کیا۔ شرف الدین ان کے اساتذہ میں سے ایک تھے جن کی خواہش پر وہ سیر و سیاحت پر نکلے تھے۔ انہوں نے دنیا کے مختلف حصوں کے سفر کئے۔ آپ جب کشمیر آئے، اس وقت کشمیر میں شاہمیری خاندان برسر اقتدار تھا۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ قطب الدین کے دور میں آپ دوبارہ کشمیر

---

[۵] خواجہ اعظم دیدمری، واقعات کشمیر، اردو ترجمہ خواجہ عبد الحمید یزدانی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۵، ص ۷۱

تشریف لائے۔ قطب الدین کا اصل نام ہندال تھا جو شہاب الدین کا چھوٹا بھائی تھا۔ قطب الدین خود بھی سید علی ہمدانی کا بہت احترام کرتا تھا اور روزانہ ان کی زیارت سے شرف یاب ہوتا تھا۔

سید علی ہمدانی پہلی بار سنہ ۱۳۷۲ء میں کشمیر آئے اور چار ماہ کے قیام کے بعد حج بیت اللہ کی غرض سے کشمیر سے رخصت ہوئے۔ حج سے واپسی پر وہ اپنے وطن ہمدان واپس گئے۔ کشمیر میں دوسری بار ان کی تشریف آوری سات سال بعد یعنی ۱۳۷۹ء میں ہوئی۔ اس بار وہ وادی میں ڈھائی سال تک مقیم رہے۔ اس کے بعد لداخ سے ہوتے ہوئے وہ ترکستان چلے گئے۔ وادی میں تیسری بار آپ کا ورود ۱۳۸۳ء میں ہوا۔ جب انہوں نے تقریباً ایک سال کشمیر میں توقف کیا۔

امیر کبیر جب تیسری بار کشمیر تشریف لائے تو ان کے ہمراہ سات سو سادات و علماء تھے جنہوں نے کشمیر میں رہ کر مختلف جگہوں پر نہ صرف تبلیغ دین کیا بلکہ صنعت و حرفت کو بھی بڑھاوا دیا۔ شال بافی، قالین بافی اور دیگر دستکاریاں کشمیر میں پروان چڑھنے لگیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ ایران کی تہذیب و تمدن وادی کشمیر میں پھلنے پھولنے لگی۔

سنہ ۱۳۸۳ء میں تیمور نے فارس پر ایک بار پھر چڑھائی کی اور علوی سادات کو، جو کہ ہمدان کی سیاست میں اہم مقام کے حامل تھے، ختم کرنا چاہا۔ شاہ ہمدان وہاں سے اپنے ساتھیوں سمیت کشمیر کی طرف اس امید پر چل پڑے کہ کشمیر میں تیموریوں کے غیظ و غضب سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اس وقت کشمیر کے حاکم قطب الدین نے ان کا بہت عزت و احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ قطب الدین پہلے ہی شاہ ہمدان سے پچھلی ملاقاتوں میں واقف ہو چکے تھے اور ان کے عقیدت مند ہو چکے تھے۔ شاہ ہمدان نے انھیں اپنی ایک کلاہ دی تھی جسے وہ زیر تاج پہنتے تھے۔

ایک سال وادی میں قیام کے بعد آپ نے رخت سفر باندھا اور ترکستان کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن وہ کافرستان کے قریب کنار پہونچے جہاں وہ سخت بیماری کی حالت میں اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ ختلان میں ان کے ایک شاگرد رہتے تھے، لہذا ختلان میں ہی انھیں سپرد خاک کیا گیا۔[۶]

میر سید علی ہمدانی کے علمی و ادبی آثار: شاہ ہمدان عربی اور فارسی کے ممتاز عالم تھے۔ انہوں نے منطق، سیاست، فلسفہ، تصوف، اخلاق، فقہ و تفسیر پہ بہت ساری کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی تصنیفات کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہیں۔ آپ نے زیادہ تر اخلاقی و عرفانی رسائل لکھے ہیں۔ آپ کی مشہور

---

[۶] محب الحسن، کشمیر سلاطین کے عہد میں، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۷ء، ص ۸۰

کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

ذخیرۃ الملوک: دس ابواب پر مشتمل یہ کتاب آپ نے سیاست اور علم اخلاق کے موضوع پر تحریر کی ہے۔ کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے بعض مطالب کچھ عربی کتابوں کے ترجمے و تلخیص پر مبنی ہیں۔ مثلاً کچھ واقعات امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم سے ماخوذ ہیں۔ یہاں پر ذخیرۃ الملوک سے ایک عبارت پیش خدمت ہے:

برادر دینی عزیزتر و دوست تر نداز فرانداان ما، زیرا کہ فرزندان، ماراد نیایادمی دھند و برادران دینی ما را آخرت یادمی دھند۔[۷]

چہل اسرار: یہ عرفا کی چالیس منزلوں پر مشتمل ایک عارف نامہ ہے۔

اورادِ فتحیہ: یہ مختلف ذکر و اذکار پر مشتمل ایک وِردنامہ ہے جو آج بھی کشمیر میں بعدِ نمازِ فجر اجتماعی طور پر بڑے خضوع و خشوع سے پڑھاجاتا ہے۔

مرأۃ التائبین: یہ رسالہ فارسی زبان میں ۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں توبہ کے سلسلے میں مطالب درج کئے گئے ہیں۔

سیر الطالبین: یہ رسالہ بیان حقائق عرفانی کے موضوع پر لکھا گیا ہے جو ۲۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

رسالۂ اعتقادیہ: پروردگار عالم کی معرفت اور عرفان کے اصول و کوائف پر ۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

رسالۂ دہ قاعدہ: چار اوراق پر مشتمل یہ رسالہ وصال پروردگار کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔

رسالۂ منامیہ: حقیقت مثال اور خواب ورؤیا کے مراتب و کوائف اور درجات خلق کے بارے میں ۴ اوراق پر مشتمل ہے۔

رسالۂ حل مشکلات: یہ بہت شیریں رسالہ ہے جو دو اوراق پر مشتمل ہے۔ در اصل درج ذیل شعر کی تشریح میں انہوں نے یہ رسالہ لکھا ہے:

ای مشکل حل و حل مشکل
زان سوی ازل بهشت منزل

۱۰۔ واردات: اس رسالے میں انہوں نے مختصر و مفید کلمات لکھے ہیں جن میں دنیا پرست علماء پر طنز کیا ہے۔ اس کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:

---

[۷] سید علی ہمدانی، ذخیرۃ الملوک، تصحیح ڈاکٹر سید محمد انواری، دانشگاہ ادبیات و علوم انسانی، موسسہ تاریخ و فرہنگ، تبریز، ۱۳۵۸ آبان، ص ۱۳۷

میراث اھل دنیامال و وقارست و میراث اھل حق گفتار و کردار۔ نصیب عالم از میراث انبیاء گفتار آمد و حق عارف کردار، نتیجہ گفتار عز دنیا و حاصل کردار قرب مولیٰ۔ مفسر در بند روایت است، و محقق مراقب درایت۔ عمل فقیہ بموجب فتویٰ بود و حال فقیر بحکم فتوی۔ اصل آن نقل و حکایت و منبع این الھام و عنایت۔ نقل و حکایت مورث سوال و حساب و الھام و عنایت سبب رفع حجاب۔[۸]

مکتوبات: آپ کے آثار میں آپ کے گرانقدر مکتوبات بھی شامل ہیں۔ جیسے:

رسالہ بہرام شاہیہ: یہ آپ کا ۱۱ صفحات پر مشتمل ایک خط ہے جو انہوں نے شیخ محمد شاہ بن سلطان خان کے نام تحریر کیا ہے۔

اس خط کے علاوہ انہوں نے بیس سے زائد دیگر خطوط بھی تحریر کئے ہیں لیکن وہ جن کے نام بھیجے گئے ہیں وہ اسماء درج نہیں ہیں۔

چہل اسرار: اس مجموعے کے آخر پر ان کی نو غزلیں اور ایک قطعہ ہے۔[۹] جو انہوں نے ایک رات میں لکھی ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ:

این غزلیات را حضرت امیر کبیر علی همدانی در یک شب فرموده اند و چون مطلع را گفتہ اند بانک ـ ـ ـ ـ بامداد داده اند ترک شعر کرده ودیگر بسر آن نرفتہ۔[۱۰]

منظوم کلام: آپ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے اور سبق عراقی و خراسانی میں شعر کہتے تھے لیکن آپ نے شاعری کو پیشہ نہیں بنایا اور نہ ہی اس کی طرف خصوصی توجہ کی۔ آپ کی شہرت شاعری سے کم اور نثری تصانیف سے زیادہ ہے۔ آپ نے جو بھی کلام لکھا اس کا مقصد لوگوں کی اصلاح تھی، کبھی کبھی وجد میں آکر عرفانی اسرار و رموز اور حضرت حق کے وصال کے اشتیاق میں اپنے جذبات کا اظہار شعری پیرایہ میں بھی کرتے تھے۔ حکیم سنائی کی پیروی میں مندرجہ ذیل نمونہ ملاحظہ ہو:

سنائی:

ای گرفتار نیاز و آز و حرص و حقد ومال　　ز امتحان نفس حسی چند باشی در وبال

---

(۸) محمود انواری، میر سید علی ہمدانی و تحلیل آثار او، نشریہ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی، تبریز، شمارہ ۱۲۳، پاییز ۱۳۵۶ش۔ ص ۳۲۱

(۹) ڈاکٹر محمد ریاض، احوال و آثار میر سید علی ہمدانی، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۱۸

(۱۰) محمود انواری، میر سید علی ہمدانی و تحلیل آثار او، نشریہ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی تبریز، ایران، شمارہ ۱۲۳، پاییز ۱۳۵۶ش۔ ص ۵۳

ہمدانی:

ای گرفتاران عشقت فارغ از مال و منال والھان حضرتت را از خود و جنت ملال(۱۱)

سید اشرف بخاری نے ان کی اکتالیس غزلوں اور نو رباعیوں پر مشتمل ایک کتاب شائع کی ہے۔ ان غزلوں میں معانی عرفان، اظہارِ اشتیاق بوصال محبوب ازلی، غم عشق، وحدت وجود وغیرہ جیسے مضامین بیان ہوئے ہیں۔

آپ کی ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

آب چون از ابر افتد قطره خوانندش همه
چون به بحر انداخت خود را نام او دریا شود
آب حیوان بایدت در ظلمت نابود شود
کانکه چشم از خود بپوشد چون خضر بینا شود(۱۲)

اقبال اور سید ہمدانی: ڈاکٹر اقبال نے اپنے کلام میں سید علی ہمدانی کی کاوشوں کو سراہا ہے اور ان سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ علامہ نے انہیں سید السادات کہہ کر خطاب کیا ہے اور لکھا ہے کہ سید علی ہمدانی کی بااثر شخصیت نے کشمیر میں دین اسلام کو پھیلانے کے ساتھ ساتھ علم و آگاہی، صنعت و حرفت کی ترویج کی، اور کشمیر کی تہذیب کو ایران کے تہذیب و تمدن سے ملا کر "ایران صغیر" قائم کیا۔

چنانچہ آپ نے مولانا روم کے طرز پر سید علی ہمدانی کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

گفت رومی آنچه می آید نگر دل مده با آنچه بگزشت ای پسر
سید السادات، سالار عجم دست او معمار تقدیر امم
تا غزالی درس الله هو گرفت ذکر و فکر از دودمان او گرفت
مرشد آن کشور مینو نظیر میر و درویش و سلاطین را مشیر
خطه را آن شاه دریا آستین داد علم و صنعت و تهذیب و دین
آفرید آن مرد ایران صغیر باهنر های غریب و دل پذیر
یک نگاه او گشاید صد گره خیز و تیرش را بدل راهی بده(۱۳)

---

(۱۱) ڈاکٹر محمد ریاض، احوال و آثار میر سید علی ہمدانی، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۱۹

(۱۲) ڈاکٹر محمد ریاض، احوال و آثار میر سید علی ہمدانی، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۲۲

(۱۳) ۔ دکتر اقبال، کلیات اقبال فارسی، کتابخانہ سنائی، تہران، ۱۳۴۳ش، ص ۳۵۸

المختصر یہ کہ کشمیر میں چودھویں صدی عیسوی کے دوران فارسی ادبیات کی پیشرفت کے حوالے سے سید علی ہمدانی نے کلیدی کردار ادا۔ آپ کا مبارک ورود انتہائی موئثر ثابت ہوا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی اس صدی میں شاہ ہمدان کی تشریف آوری اور ان کی ہمہ گیر فعالیت کشمیر کی تاریخ کا اہم ترین اور درخشان ترین باب شمار کیا جاتا ہے۔ آپ کے ہمراہ آئے ہوئے علماء وسادات کشمیر کی سرزمین میں گویا بیج کے مانند گھل مل گئے جس کی وجہ سے کشمیر میں اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب کی نئی کونپلیں پھوٹ پڑیں، جس کی خوشبو نے آگے چل کر ملا محمد طاہر غنی و محسن فانی کشمیری جیسے شعرا کے مشام کو معطر کرکے انھیں فارسی زبان وادب کے بام عروج تک پہنچا دیا۔ سید علی ہمدانی کشمیر اور کشمیریوں پر بہت بڑا احسان کرکے رخصت ہوئے۔ ان کا نام آج بھی کشمیریوں کے دل ودماغ میں قائم ودائم ہے۔ ان کی گرانقدر خدمات کی بناپر بالخصوص کشمیر میں انھیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

***

اخبار علمیہ

پہلی بار روبوٹ کے ذریعہ دانتوں کی سرجری

ایک خودکار روبوٹ نے مکمل طور پر انسان کے دانتوں کا آپریشن کیا، دنیا میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا آپریشن تھا۔ برطانوی اسکائی نیوز نیٹ ورک کے مطابق روبوٹ نے آپریشن کرنے کے لیے اپنے روبوٹک بازو، مصنوعی ذہانت اور مریض کے دانتوں اور منہ کے تھری ڈی اسکین پر انحصار کیا۔ ریاستہائے متحدہ امریکا کی Perceptive نامی کمپنی کا کہنا ہے کہ اسے امید ہے کہ اس کی ٹیکنالوجی آپریشن اور دانتوں سے متعلق دیگر امراض کے طریقۂ علاج بشمول فلنگ (بھرنے) اور کراؤننگ (دانتوں پر کیپ لگانے) کو انجام دینے میں زیادہ درست اور تیز تر ہو جائے گی۔ کمپنی کا دعویٰ ہے کہ آج ڈاکٹر دانتوں پر کراؤن لگانے میں دو گھنٹے صرف کرتے ہیں، مستقبل میں اس تکنیک کے ذریعہ صرف ۱۵ منٹ میں یہ کام مکمل کیا جاسکے گا۔ کمپنی کے بانی اور سی ای او ڈاکٹر کرس سیریلو نے کہا: یہ طبی ایجاد دانتوں کے طریقہ علاج کی درستگی اور کارکردگی کو بڑھاتی ہے۔ روبوٹ کو امریکی فوڈ اینڈ ڈرگ ایڈمنسٹریشن سے منظوری نہیں ملی ہے، لیکن اس کے بنانے والوں کا اصرار ہے کہ یہ محفوظ ہے اور دعویٰ ہے کہ ان کی ٹیکنالوجی دندان سازی کے میدان میں انقلاب برپا کردے گی۔ (الشرق الاوسط، ریاض، ۶/اگست ۲۰۲۴ء صفحہ تکنولوجیا)۔

"چیخنے والی عورت" کی ممی کی باقیات کی تحقیق

ماہرین آثار قدیمہ نے ۱۹۳۵ء میں الاقصر (مصر) کے قریب ایک مقبرے میں تقریباً ۳۵۰۰ سال پہلے مرنے والی "چیخنے والی عورت" کی ممی شدہ باقیات دریافت کیا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا ہے۔ سائنسدانوں نے حال ہی میں اس ممی کی شکل، صحت اور تحفظ کے بارے میں تفصیلات بالخصوص اس کے چہرے کے حیرت انگیز تاثرات کی وجہ سمجھنے کے لیے سی ٹی اسکین اور انفراریڈ امیجنگ اور دیگر جدید تکنیکوں کا استعمال کیا۔ پتہ چلا کہ موت کے وقت اس کی عمر ۴۸ سال تھی۔ عمر کے ساتھ بدلنے والے پیڑو کا جوڑ اس تجزیے کی بنیاد ہے۔ قاہرہ یونیورسٹی کے القصر العینی ہسپتال میں ریڈیولوجی کے پروفیسر سحر سلیم کا بیان ہے کہ اس کے جسم پر لوبان اور سدابہار صنوبری جھاڑ اور مہنگے مادوں سے ممی کی گئی تھی جو دور دراز علاقوں سے منگائے جاتے تھے۔ (جرنل فرنٹیئرز ان میڈیسن، سی این این، از کیٹی ہنٹ، ۲/اگست ۲۰۲۴ء)

ک۔ ص۔ اصلاحی

وفیات

پروفیسر معین الدین شاہین

محمد مستقیم
ریسرچ اسکالر، مہرشی دیانند سرسوتی یونیورسٹی، اجمیر
موبائل نمبر: ۸۳۸۶۰۳۱۵۲۲

۲۴ر مئی ۲۰۲۴ کو پروفیسر شاہین صاحب کے فرزند اور میرے عزیز دوست محمد سروش نے یہ پر درد اطلاع دی کہ کل ۲۳ر مئی ۲۰۲۴ کی رات کو والد صاحب اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

پروفیسر شاہین صاحب کی ولادت ۲ر فروری ۱۹۶۸ کو ضلع اجمیر شریف راجستھان میں ہوئی۔ ان کا نام معین الدین اور تخلص شاہین تھا۔ ابتدائی تعلیم معینیہ اسلامیہ ہائی اسکول اجمیر شریف میں ہوئی۔ بی اے گورنمنٹ کالج اجمیر سے ۱۹۸۸ء میں اور اسی کالج سے ۱۹۹۰ء میں ایم اے کیا۔ شاہین صاحب راجستھان کے دوسرے اردو جے آر ایف تھے۔ انہوں نے پی ایچ ڈی مقالہ ”رام بابو سکسینہ: حیات و خدمات“ کے موضوع پر پروفیسر فیروز احمد صدر شعبہ اردو و فارسی راجستھان یونیورسٹی کی نگرانی میں سپرد قلم کیا اور مارچ ۱۹۹۶ء کو انہیں ڈاکٹریٹ کی سند تفویض ہوئی۔ موصوف کی ملازمت کا آغاز ۱۹۹۱ء میں بحیثیت اردو لیکچرر گورنمنٹ کالج ٹونک سے ہوا۔ تقریباً چار ماہ بعد یہاں سے ان کا تبادلہ راقم الحروف کے شہر بیکانیر راجستھان میں گورنمنٹ ڈونگر کالج میں اسی عہدے پر ہوا۔ یہاں تقریباً ۲ سال رہے اور اس شہر کی ادبی فضا کو رونق بخشتے رہے۔ ۲۰۱۸ میں ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج اجمیر میں ہوا اور تادم واپسیں اسی کالج سے وابستہ تھے۔ پروفیسر شاہین صاحب نے اردو زبان و ادب اور شعر و تنقید پر تقریباً ایک درجن کتابیں لکھیں۔ بعض کے نام اس طرح ہیں:

فرزانگی (شعری مجموعہ)، نذرِ غالب و اقبال، ہماری زبان اردو، گلستان اردو، گلدستۂ ادب، گلزار ادب، صدائے اردو، انتخاب نثر و نظم، نوائے اردو، آئینہ ادب، مجاہد ادب شاہد احمد جمالی۔ یہ تمام ہی کتابیں ۲۰۰۰ء سے ۲۰۱۹ء کے دوران انمول پرنٹرس، جودھپور سے طبع ہوئی ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے مختلف ادبی موضوعات پر دو درجن مقالات بھی تحریر کیے ہیں جو اردو کے متعدد رسائل و جرائد معارف اعظم گڑھ، جامعہ، ایوان اردو، فکر و تحقیق، ہماری زبان دہلی وغیرہ میں اہتمام سے شائع کیے گئے۔

ادبی دنیا میں معین الدین شاہین صاحب کو اس لیے بھی احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے کہ ان کی تحقیقی و تنقیدی رائے متوازن ہوتی ہے۔ شاعری کی وجہ سے ان کے لب ولہجہ میں تاثیر بھی پائی جاتی تھی۔ تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اللہ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے۔

شاہد بدر فلاحی کی رحلت

نعمان بدر فلاحی

ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

nomanbadaralig@gmail.com

اس عالم آب و گِل سے آپ کی یوں اچانک رخصت سے دل بے حد مغموم ہے۔ کیسے یقین کریں کہ اب جیتے جی آپ سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ جامعۃ الفلاح، علی گڑھ، لکھنؤ اور دہلی وغیرہ میں آپ کی شفقت، عنایت، خورد نوازی، حوصلہ افزائی اور وعظ و نصیحت سے تقریباً ۳۵ برس تک فیض یاب ہوتا رہا۔ آپ کی تنظیمی رفاقت، مصاحبت، معیت اور سرپرستی میں بیتے شب و روز، ماہ و سال اور احوال و کوائف ذہن کی اسکرین پر کسی فلم کی مانند مسلسل نمودار ہو رہے ہیں۔

آپ کی خوش کن باتیں، آپ کی پرجوش تقاریر، آپ کے بلیغ خطبے، آپ کی موثر تحریریں، آپ کے ادبی رجحانات، آپ کی شگفتہ مزاجی، آپ کا تبسم، آپ کی بذلہ سنجی، آپ کی ظرافت طبع، آپ کی برمحل شعر خوانی، آپ کی قصہ گوئی، آپ کی منظر کشی، آپ کی علمی بحثیں، آپ کے تحریکی نظریات، آپ کے بلند عزائم، آپ کی تنظیمی سرگذشت، آپ کی فکرمندیاں، آپ کی عقابی نگاہیں، آپ کے برجستہ تبصرے، آپ کی قوت گویائی اور آپ کی بے باک آراء اب ماضی کا ایک سنہری باب ہیں۔ تاریخ ایسے ہی بنا کرتی ہے۔

سنہ ۱۹۹۰ء کی بات ہے۔ جامعۃ الفلاح میں عالمیت کے ابتدائی سالوں میں جب میں نے قلم پکڑنا سیکھا تو آپ ہی نے مجھے مضمون نویسی کے گر بتائے۔ جو کچھ الٹا سیدھا رقم کرتا آپ اس کی اصلاح کرتے اور نوک پلک درست کر کے طلبہ کے ہفتہ روزہ وال میگزین 'عرفان' اور ماہانہ قلمی رسالہ 'شاہین' میں اشاعت کے لائق بناتے۔ طلبہ تحریک میں میری شمولیت، تربیت، ذہن سازی اور ادبی ذوق کی آبیاری میں آپ کا بنیادی کردار ہے۔ شاہد بھائی نے مجھے ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھا۔ اکثر لوگوں سے جب میرا پہلی بار تعارف ہوتا ہے تو ناموں میں 'بدر' کے لاحقہ کی وجہ سے پوچھتے ہیں "کیا آپ شاہد بدر کے بھائی ہیں؟"

سنہ ۲۰۰۳ء میں پس دیوار زنداں تقریباً ایک ماہ ہائی سکیوریٹی وارڈ کے اندر اُن کی بیرک میں ساتھ رہا۔ وہاں موجود کتنے ہی جاں باز سپاہی ان کے مرید ہوگئے تھے۔ ایک افغان مجاہد تازہ خان کی زبان ہر وقت بس حضور، حضور کی گردان سے تر رہتی تھی۔ دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے پروفیسر عبد الرحمن گیلانی مرحوم سے جیل میں ان کی رفاقت، مکاتبت اور ارادت مندانہ تعلق کا میں بھی گواہ ہوں۔ شاہد بھائی اپنی روداد اسیری "شاہد زنداں" کے عنوان سے مرتب کرنا چاہتے تھے۔ کام کا آغاز کیا تھا مگر شاید مکمل نہ کرسکے۔

شمشاد مارکیٹ میں واقع علی گڑھ کی قدیم ترین اسلامک لائبریری میں (جو طلبہ تحریک پر پابندی کے بعد سے مقفل ہے) آپ کے ساتھ گذرے شام وسحر، عشاء کی نماز کے بعد سائیکل پر سوار ہو کر کھانے کے لیے تصویر محل تک ساتھ جانا، یونیورسٹی جامع مسجد، حبیب ہال، علامہ اقبال ہال، سلیمان ہال، وی ایم ہال، آر ایم ہال وغیرہ کی مساجد میں آپ کے دروس قرآن، خطاب عام، شب گذاریاں اور تربیتی پروگراموں میں آپ کی تذکیر، سب کچھ یاد آرہا ہے۔

علی گڑھ میں تحریکی افراد اور فارغین مدارس کی نماز فجر بالعموم متاثر رہتی ہے، مگر شاہد بھائی اپنے اقامتی ہال کے بجائے اکثر فجر کی نماز علامہ اقبال ہال، سلیمان ہال، اور سر ضیاء الدین ہال کی مسجد میں ادا کرتے اور رفقاء کے کمروں پر جاکر ان کی خیریت دریافت کرتے۔ یونیورسٹی کے سینئر طلبہ سے ان کے تعلقات خوشگوار اور مراسم گہرے تھے۔ تحریکی مفاد کے پیش نظر تنظیم کے علاوہ بھی ان کا ایک حلقۂ احباب تھا جس کے ساتھ ڈھابے پر بیٹھ کر پابندی سے چائے نوش کرتے تھے۔ محمود الرحمن صاحب مرحوم جب ۱۹۹۵ء میں شیخ الجامعہ کی حیثیت سے علی گڑھ تشریف لائے تو شاہد بھائی نے انہیں ایک تفصیلی خط لکھا اور یونیورسٹی کی موجودہ صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد اپنے مشورے اور عملی تجاویز اُن کے سامنے پیش کیں۔ ان کا مسکن محمد حبیب ہال کا کمرہ نمبر ۷۲۵ نووار دان علی گڑھ کے لیے ایک سرائے تھا۔ وہاں قیام کرنے والے طلبہ ان کے گرویدہ اور شخصیت کے اسیر ہو جاتے:

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ان کا ادبی اور شعری ذوق نہایت بلند اور ستھرا تھا۔ جامعۃ الفلاح کے زمانۂ طالب علمی میں جب وہ طلبہ تحریک میں کسی ذمہ دارانہ منصب پر فائز نہیں ہوئے تھے، شعری نشستوں اور مقامی مشاعروں میں نظامت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ممکن ہے ان کے اس ذوق کی نشوونما میں ان کے شاعر ماموں قمر رسول پوری کا بھی کردار ہو۔ کوئی محفل ہو، کوئی موضوع ہو اور کوئی موقع ہو، ان کی زبان پر اشعار ایسے بہتے تھے جیسے پہاڑی چشمے سے پانی بہتا ہے۔ نجی محفلوں میں اسلامی شعراء کے علاوہ فیض احمد

فیض، پروین شاکر اور جوش وغیرہ کے معیاری اشعار بھی موقع و محل کی مناسبت سے بیان کرتے۔

جون ۱۹۹۷ء میں مہاراشٹرا کے پر فضا پہاڑی مقام چکل دھرا میں منعقد دس روزہ کیمپ کے دوران شعری اور ادبی نشست میں شاہد بھائی کی لاجواب نظامت کا میں خود مشاہد ہوں۔ پروفیسر مسعود احمد (بایو کیمسٹری، علی گڑھ) نے ان کی نظامت پر حیرت و استعجاب میں ڈوبی ہوئی بے انتہا مسرت کا اظہار کیا تھا۔

ان کی تحریروں میں گرچہ تنظیمی مصروفیات، ذمہ داریوں کے بوجھ اور مستقل درس، تقریر اور خطاب کی وجہ سے تقریر کا رنگ غالب نظر آتا ہے مگر ان میں فکری پختگی، نظریاتی بلندی اور علمی گہرائی کے ساتھ ادب کی چاشنی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ ان کے مضامین، مقالات، پیغامات، انٹرویوز اور خطابات کا مجموعہ شائع ہو جائے۔

جنوری ۱۹۹۷ء میں طلبہ تحریک کی 'نیشنل ازم یا خلافت؟' مہم کے موقع پر سید علی شاہ گیلانی مرحوم کی موجودگی میں کینیڈی ہال کے اندر علامہ اقبال کے انقلابی اشعار سے مزین ان کے فصیح و بلیغ خطاب کی شان بھلائی نہیں جاسکتی۔ نیشنلزم کے موضوع پر یہ ایک عالمانہ تقریر تھی جس کا تذکرہ علی گڑھ کی تاریخ میں ضرور ہوگا۔ اسی موضوع کے تحت تقریباً ۶۰ صفحات پر مشتمل ان کا ایک کتابچہ بھی اسی زمانے میں شائع ہوا تھا۔

ان کے خطاب میں دریا کی روانی کے ساتھ بپھری ہوئی موجوں کی طغیانی بھی ہوتی تھی۔ الٰہی آیات، فرامین رسولؐ، تاریخی واقعات اور خوبصورت انقلابی اشعار سے اپنی تقریر کو سجانے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ نومبر ۱۹۹۷ء میں اجتماع اخوان، علی گڑھ کے دوران 'تاریخ عشق و وفا' کے موضوع پر ان کے خطاب کے دوران سامعین کی آنکھوں سے بہتے آنسو اور اکتوبر ۱۹۹۸ء میں لکھنؤ کی ٹیلے والی مسجد میں 'البدر کی داستان عزیمت' کی سماعت کے دوران نوجوانوں کی ہچکیاں ان کے 'عزیز مصر خطابت' ہونے کی دلیل ہیں۔

فروری ۲۰۰۰ء میں ملک گیر طلبہ تحریک ایس آئی ایم آف انڈیا کے صدر منتخب ہونے کے بعد ماہ نامہ 'اسلامک موومنٹ' کے ذریعہ ان کا جو پہلا پیغام نشر ہوا اس کا عنوان حفیظ میرٹھی کا یہ مصرع تھا: جب تک دیوانے زندہ ہیں آباد رہیں گی زنجیریں۔

مارچ ۲۰۰۱ء میں نئی دہلی میں واقع اقوام متحدہ کے دفتر کے سامنے وشوہندو پریشد اور بجرنگ دل کے غنڈوں نے قرآن پاک کو نذر آتش کیا اور حرمین کی تصاویر کی بے حرمتی کی تو طلبہ تحریک کی کوششوں کے نتیجے میں تشکیل پانے والے ایک کل جماعتی وفد نے انگریزی ہفت روزہ 'ریڈینس' کے مدیر امین الحسن رضوی مرحوم کی قیادت میں وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی سے ان کی رہائش گاہ پر

ملاقات کی۔ مولانا عبد الوہاب خلجی، احمد بخاری، عبید اللہ خان اعظمی جیسے بزرگ اور منجھے ہوئے قائدین کی موجودگی میں شاہد بھائی نے مومنانہ شان اور جرأت کے ساتھ وزیر اعظم واجپئی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس دل فگار واقعے کی تفصیلات پیش کیں اور انہیں اس کے انجام سے باخبر کیا۔

اپریل ۲۰۰۰ء میں سہ روزہ دعوت، دہلی نے ”ماضی حال، مستقبل“ کے عنوان سے اپنی خصوصی اشاعت کے لیے علمائے کرام، زعمائے ملت اور ملی جماعتوں کی ذمہ دار شخصیات کے نام ایک سوال نامہ جاری کرکے کچھ بنیادی نوعیت کے سوالات پر غور و فکر اور گفتگو کی دعوت دی تھی۔ دعوت کے مدیر پرواز رحمانی کا سوال نامہ موصول ہوا تو شاہد بھائی نے ایک مضمون کی شکل میں تمام سوالات کے جواب دیے جو دعوت کی خصوصی اشاعت میں موجود ہے۔ مضمون میں انھوں نے آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف النوع مسائل، اُن کی موجودہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور تعلیمی صورت حال کا بے لاگ تجزیہ کرنے کے بعد اکیسویں صدی میں مسلمانان ہند کے لائحۂ عمل اور دینی شناخت کے تحفظ کے سلسلہ میں ٹھوس تجاویز پیش کی تھیں۔

طلبہ تحریک کے قیام کی ۲۵ سالہ تقریبات کا افتتاحی جلسہ اپریل ۲۰۰۱ء میں غالب اکیڈمی، دہلی میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوا تھا۔ کھچا کھچ بھرے کانفرنس ہال میں شاہد بھائی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

> حکومت کے ظلم و ستم کے باوجود آج ایس آئی ایم ملت اسلامیہ کے دلوں کی دھڑکن بن چکی ہے۔ بڑی تعداد میں جری اور حوصلہ مند نوجوان اس میں شمولیت اختیار کررہے ہیں۔ تحریک کے خلاف حکومت اور انتظامیہ کی معاندانہ یلغار سے کارکنان خوف زدہ ہونے کے بجائے نصرت الٰہی کے سہارے ان شاء اللہ صبر و استقامت کا مظاہرہ کریں گے۔ ہم ہر حال میں اپنی منزل کی جانب بڑھتے رہیں گے، اگر چلنے کی طاقت نہ ہوگی تو گھسٹتے رہیں گے اور اگر اتنی طاقت بھی نہ ہوگی تو آنکھوں سے آگے بڑھنے کا اشارہ ہی کریں گے لیکن باطل کے آگے سرنگوں نہیں ہوں گے اور نہ ہی اپنا راستہ تبدیل کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

اگست ۲۰۰۱ء میں طلبہ تحریک کے کل ہند سکریٹری وقار الحسن کی غیر قانونی گرفتاری کے خلاف شاہد بھائی کی قیادت میں سیکڑوں کارکنان ایس آئی ایم نے پارلیمنٹ اسٹریٹ دہلی پر ایک مظاہرہ کیا تھا۔ جب دہلی پولیس نے مظاہرین کو ایک مقام پر روک لیا تو انہوں نے وہیں پر مظاہرین سے خطاب کیا اور تنظیم کے سکریٹری کی رہائی کے سلسلہ میں صدر جمہوریہ کے نام ایک میمورنڈم بھی پیش کیا۔ علی گڑھ میں شاہد بھائی کے معاصر اور اسلامی معاشیات کے ماہر ڈاکٹر شارق نثار علیگ کہتے ہیں:

> میں نے ان کے اندر لیڈرشپ کی بہترین خصوصیات دیکھی ہیں۔ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملتے اور فوراً

سینے سے لگا لیتے۔ طلبہ کا تعاون دل کھول کر کرتے تھے، تنگی ترشی میں رہتے مگر دل بہت کشادہ تھا۔ جن طلبہ کو ہاسٹل میں کمرہ نہیں مل پاتا تھا انہیں شاہد بھائی کے یہاں پناہ ملتی تھی۔ ان کے پاس جا کر سکون ملتا تھا، وہ معاملات اور مسائل کو بہت آسان بنا دیتے تھے۔ معاشیات میں گریجویشن کے بعد میں نے ان کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی کہ میری اردو، عربی اور اسلامیات وغیرہ کی تعلیم نہیں ہو سکی ہے، اس لیے میں اب کسی مدرسے میں داخلہ لینا چاہتا ہوں، مگر انہوں نے مجھے اس اقدام سے روکا اور وجہ پوچھنے پر کہا "مجھے خدشہ ہے کہ وہاں جا کر تمہارے دل میں مدرسے اور علماء کی جو قدر، احترام اور عزت ہے، کہیں وہ کم نہ ہو جائے۔

واشنگٹن ڈی سی میں مقیم انجینئر افضال عثمانی علیگ، شاہد بھائی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ عمر میں مجھ سے بڑے تھے، مگر علی گڑھ میں، میں ان سے سینئر تھا۔ وہ فجر سے پہلے بیدار ہو جاتے تھے اور میرے لیے یہ کام بہت مشکل تھا۔ ایک روز مجھے صبح صبح کوچنگ کے لیے کلاس روم کی چابی تقریباً ۵ کلومیٹر دور بالائے قلعہ (اپر کورٹ) سے جا کر لانی تھی۔ میں اسی غرض سے حبیب ہال میں ان کے کمرے پر سویا تا کہ صبح اٹھ کر وہاں جا سکوں۔ جب میری آنکھ کھلی تو دیکھا سورج سر پر آ گیا ہے اور شاہد بھائی بھی سو رہے ہیں۔ میں نے ہڑبڑاہٹ میں انہیں جگایا تو معلوم ہوا کہ وہ فجر بعد سائیکل سے اپر کورٹ جا کر چابی لے بھی آئے اور میں سوتا ہی رہا۔ اس واقعہ نے مجھے بہت متاثر کیا۔

مجھے تنظیم کی مختلف پالیسیوں اور پروگراموں سے اختلاف رہتا تھا اور میں شاہد بھائی سے کھل کر اس کا اظہار بھی کرتا، مگر میں ان کی کرشماتی شخصیت اور ان کی ذات میں موجود جاذبیت اور کشش کا ہمیشہ اسیر رہا۔ وہ مقصد جو انہیں بہت عزیز تھا اس کے لیے ان کی سنجیدگی، لگن، اخلاص، فداکاری، قربانی اور Commitment نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ایک بار میں بیمار ہوا تو وہ میری عیادت کے لیے ہیلتھ سینٹر تشریف لائے اور علامہ ماہر القادری کی 'دریتیم' اور شیخ علی طنطاوی کی 'اسلام کا عام فہم تعارف' مطالعہ کے لیے دی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کی ذات عزیمت، استقامت، اولو العزمی، فداکاری اور شجاعت کا استعارہ تھی۔ ایک مرد درویش کی مانند تا دم واپسیں تند و تیز زعفرانی ہواؤں کے درمیان چراغ جلاتے رہے اور حوصلہ بانٹتے رہے۔ طوق و سلاسل، مقدمات، مصائب و آلام، اپنوں کے دل شکن فقرے، طعنے، الزامات اور خفیہ سرکاری اداروں کی مستقل تفتیش سے ان کے پاؤں میں ذرا لغزش نہیں آئی۔ ان کے سینے میں موجود مضطرب، بے تاب اور کڑکتی بجلیاں باطل کے خرمن کو جلا کر راکھ کر دینے پر ہمیشہ آمادۂ پیکار رہیں۔ شاعر مشرق کے الفاظ میں 'وہ فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز' تھے۔

کاروان جنوں سے اپنی وابستگی کا جب کبھی تذکرہ کرتے تو زمین رسول پور (اعظم گڑھ) کے حافظ ڈاکٹر صباح الدین فلاحی کا ذکر بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ کرتے تھے کہ وہی انہیں تحریک میں لے کر آئے تھے۔ عنفوان شباب میں بلریاگنج کے حکیم محمد ایوب اور حافظ محمد عیسیٰ کی صحبت میں بیٹھ کر کسب فیض کیا۔ وہ مولانا محمد طاہر مدنی کے محبوب شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے مولانا مجیب اللہ ندوی سے بھی استفادہ کیا۔ ڈاکٹر تابش مہدی کے بڑے معتقد تھے اور ان سے خصوصی ربط و تعلق قائم رہا۔ ان کے سیال قلم سے فکو العانی، آفتاب رسالتؐ شعب ابی طالب میں، سر گزشت عافیہ، کوہ استقامت: حبۃ الدباغ، نیشنل ازم یا خلافت، چرم قربانی کا مصرف، ۱۷ر رمضان یوم الفرقان جیسی کتابیں نکلیں اور زیور طبع سے آراستہ ہو کر نوجوانوں میں بطور خاص مقبول ہوئیں۔

شاہد بدر کی پیدائش ۱۲ر نومبر ۱۹۷۱ء کو اعظم گڑھ شہر سے تقریباً ۳ میل کے فاصلے پر واقع موضع 'منچوبھا' میں ہوئی۔ والد ڈاکٹر بدر عالم صاحب (جو ابھی باحیات ہیں) کے دو بیٹوں میں شاہد بدر بڑے تھے۔ بچپن میں ہی ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، اس لیے پرورش اور ابتدائی تعلیم ننھیال موضع 'زمین رسول پور میں' ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعۃ الفلاح، بلریاگنج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۹۱ء میں فضیلت کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اجمل خاں طبیہ کالج میں 'پری طب' میں داخلہ لیا، ۱۹۹۷ء میں 'بی یو ایم ایس' مکمل کرنے کے بعد ایس آئی ایم کے زونل صدر بنا دیے گئے اور فروری ۲۰۰۰ء میں مرکزی صدر کی ذمہ داری پر فائز ہوئے۔ ۲۷ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو حکومت ہند نے اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا کو خلاف قانون قرار دے کر اس کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی تو مرکزی صدر ڈاکٹر شاہد بدر فلاحی بھی اپنے متعدد رفقاء کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے۔ تین برس سے زائد دہلی کی سینٹرل تہاڑ جیل میں گذارنے کے بعد ضمانت پر رہا کیے گئے۔ ان کے خلاف فرضی مقدمات کی ایک طویل فہرست ہے مگر اکثر میں عدالتوں نے ان کو باعزت بری کر دیا۔

جیل سے رہائی کے بعد انہوں نے اعظم گڑھ شہر میں یونانی طب کے میدان میں خدمت کے لیے البدر یونانی شفاخانہ قائم کیا جو بہت جلد ضلع بھر کے مریضوں کا مرجع بن گیا۔ اپنے طبی تجربات پر مضامین لکھ کر مختلف پیچیدہ امراض کے مجرب نسخوں کو عام کر دینا ان کا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ ۲۰ر جولائی ۲۰۲۴ء کو پانچ روزہ بیماری کے بعد اعظم گڑھ کے ایک ہسپتال میں ظہر کے وقت جان مالک حقیقی کے سپرد کی اور بعد نماز عشاء اپنے آبائی گاؤں 'منچوبھا' کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ۶ بیٹے اور ۴ بیٹیاں موجود ہیں۔ مولانا محمد علی جوہرؒ نے اپنے ایک رفیق کار کی رحلت پر تعزیت کرتے ہوئے ایک نظم کہی تھی جس کا یہ شعر میرے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے: تم کو ایسے ہی تھا اگر جانا، چند نعم البدل دیے ہوتے۔

تبصرۂ کتب

مولاناسید محمود الحسن ندوی مرحوم، مرتب ڈاکٹر سید محمد صبیح، **دنیائے اسلام**، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد مع گردپوش، صفحات **۴۳۶**، باہتمام پروفیسر سید وسیم اختر، قیمت: **۵۰۰** روپے، پتہ درج نہیں۔

موجودہ ذرائع ابلاغ کی کثرت اور نہایت ترقی یافتہ تکنیکی استعمال کی بدولت اب عالمی مسائل سے واقفیت بڑی آسان ہوگئی ہے۔ مثال کے طور پر شرق اوسط کے حالات ہیں، جہاں جنگ و جدال سے پیدا ہونے والا ہر واقعہ مع تجزیہ فوری طور پر سامنے آجاتا ہے۔ لیکن خبروں کی تیز رفتاری نے اس فکر و نظریہ پر برا اثر ڈالا ہے جو شے کی حقیقت کو دیکھنے اور سوچنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ احساس زیر نظر کتاب کی تحریروں سے اور بڑھ جاتا ہے۔ قریب ساٹھ ستر سال پہلے کی یہ تحریریں ایسے قلم کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جو قلب و ذہن کے خوبصورت ترین آمیزہ سے تیار ہوتا ہے۔ صاحب قلم ندوی بھی تھے اور جدید علوم سے بھی بہرہ ور تھے۔ عربی خصوصاً جدید عربی زبان و ادب کے وہ اداشناس تھے، برسوں عالم عرب میں رہے، ہندوستان میں ریڈیو کی عربی نشریات کے شعبہ سے بھی وابستہ رہے۔ اس لیے ان کا علم و مطالعہ دونوں شرق اوسط کے تعلق سے شنید سے زیادہ دید کی بنیاد پر رہا۔ اپنے وقت کے سید الاخبار قومی آواز لکھنؤ میں شرق اوسط کے حالات و معاملات پر وہ مستقل اظہار خیال کرتے۔ ۱۹۶۰-۱۹۶۳ تک کی یہ تحریریں گرچہ بہت پرانی ہوچکی ہیں، تاہم وہ بوسیدہ و فرسودہ اس لیے نہیں کہی جاسکتیں کہ عالم عرب کی موجودہ سیاست اور صورت حال کے سمجھنے کے لیے یہ پہلے سے زیادہ کام کی ہیں۔ قریب سو عنوانوں کے تحت اکثر تحریریں عرب دنیا ہی سے متعلق ہیں، لیکن ان کے مجموعہ کو دنیائے اسلام کا نام دیا گیا، عراق، بیروت، دمشق، مراکش، فلسطین، عدن، ایران، الجیریا، اسرائیل، مصر، سعودی عرب کے تعلق سے وہاں کی مذہبی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی زندگی کا گویا یہ نہایت مستند مرقع اور دستاویز ہے، ساتھ ہی اسرائیل و عرب کی موجودہ نہایت تکلیف دہ صورت حال کی بنیادوں کو بھی اس آئینہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً ۲۲/جون ۶۱ کی ایک تحریر کا عنوان ہے ''کیا مشرق وسطیٰ میں جنگ ہوگی؟'' لکھا کہ ''اسرائیلی وزیر اعظم دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش میں ہیں کہ مستقبل قریب میں مشرق وسطیٰ میں ایک زبردست جنگ ہوگی جس کے اصل فریق عرب ممالک اور اسرائیل ہوں گے اور جو بڑھ کر تیسری عالمی جنگ کی شکل اختیار کرے گی۔ اسرائیلی فوج حملے کرنے میں پیش قدمی کرے گی۔ ہوسکتا ہے اقوام متحدہ اور اسرائیل کے بعض دوست ملک اور خود اسرائیل کے یہودی اس اقدام کو ناپسند کریں لیکن یہ مسئلہ ہمارے لیے موت و حیات کا مسئلہ ہے۔''

یعنی اب جو ہو رہا ہے وہ نیا نہیں بلکہ ایک طویل مدتی منصوبہ بند سازش کے تحت ہے۔ یہی کیا

عربوں کی سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر جو لکھا گیا وہ اب بھی کچھ زیادہ بدلا نہیں۔ ایک مضمون میں لکھا کہ آج کل عرب یونی ورسٹیوں اور تعلیم گاہوں کے اساتذہ سستی شہرت اور عوامی مقبولیت کی تلاش میں، سہولت پسندی اور تن آسانی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اب ان کی علمی کاوشیں تلاش و تحقیق کا نمونہ ہونے کے بجائے سطحی اور غیر معیاری ہوتی جا رہی ہیں۔ غرض یہ تحریریں البم کی پرانی تصویروں کی طرح ایک الگ ہی دلچسپی اور ساتھ ہی عبرت کا نمونہ ہیں۔ ایک خوبی تحریر کی شگفتگی اور انشائی حسن ذوق ہے، مضامین کی سرخیاں ہی سامان کشش بن جاتی ہیں، جیسے خاک ایران میں امکان شرر، سکون قلب، عرب خواتین کی متاع گم گشتہ، قید خانوں کے ادیب، خودکشی کا موسم، شاہ سعود کی شاہ خرچیاں، کار شیشہ و آہن، میر احصہ دور کا جلوہ، کتابوں کا قید خانہ جامعہ ازہر وغیرہ۔ اس دستاویزی حیثیت اور اہمیت کے مجموعہ مضامین کی اشاعت تمام تر مصنف مرحوم کے ہمشیر زادہ پروفیسر وسیم اختر کے ذوق و شوق کی بڑی دلکش تصویر ہے، اتنی خوبصورت طباعت کے لیے وہ صحیح معنوں میں لائق تحسین ہیں۔ (محمد عمیر الصدیق ندوی)

محمد عرفان جونپوری، **مضامین عرفان**، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۲۴۰، پتہ: مکتبہ جامعہ، دہلی، پٹنہ، احمد آباد اور ممبئی کے ممتاز مکتبے، موبائل: ۹۰۴۴۴۲۴۲۰۸

دارالسرور، رام پور بھی ہے اور برہان پور بھی لیکن اس خطاب کا ایک اور مستحق شہر جونپور بھی کم نہیں، جس شہر کے ماضی کی داستان شاہانِ شرقی کے کارناموں سے روشن ہو، جس شہر کو شیر ازِماست کا درجہ عطا ہوا ہو، اس شہر کی تب و تاب کو جاودانہ ہونے کا حق ہے اور اس حق کو اس شہر کے علماء و فضلاء اور ادیبوں اور شاعروں نے بڑی حد تک ادا کرنے اور قائم رکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ نامساعد حالات میں اردو ادب و تہذیب کی آبیاری کرنے والوں میں زیر نظر کتاب کے مصنف بھی ہیں۔ جن کے بارے میں پروفیسر عبدالحق جیسے فاضل اجل کے قلم سے تحسین و تبریک کے الفاظ موتیوں کی لڑی کی شکل میں اس طرح سامنے آئے کہ ''عصر حاضر میں شیر از شرق کی باز آفرینی پر مامور ...... شرقیات سے شغف رکھنے والا ایسا مرد کار نہیں دیکھا''۔ یہ خود ایک سند ہے کہ ''عرفان جونپوری کا ذخیرۂ علم کسی فرہنگ سے کم نہیں''۔ پیشِ نظر مجموعہ مضامین اسی قول کا شاہد صادق ہے۔ مضامین میں غالب کے ایک گم نام شاگرد زیدی جونپوری اور سر شاہ سلیمان کے تذکرے سے جونپور کی علمی، تہذیبی اور تاریخی روایات تک الگ الگ شخصیتوں، ان کے مضامین اور کتابوں پر معلومات افزا تحریریں ہیں، شرقی دور کے فارسی شعراء کی ہندی نظمیں اور مولانا شوکت علی کی ملی فعالیت جیسے مضامین خاص طور پر دلچسپ ہیں اور اس سے بھی زیادہ نئے معلومات پر مشتمل ہیں۔ یہ مصنف کا انکسار ہے کہ ان کو اپنے مضامین میں کوئی چاشنی یا نئی تحقیق کی کرن نظر نہیں آتی۔ ورنہ کتنوں کو خبر ہے کہ

مصحفی کے ایک شاگرد کاہش جونپوری کو اردو کا باضابطہ صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا گیا ہے یا یہ کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی شرقی دربار سے منسلک تھے، سلطنت ختم ہوئی تو وہ شاہ آباد اور پھر گنگوہ چلے گئے یا یہ کہ اردو صحافت کے موضوع پر پہلی کتاب ''ہماری صحافت'' لکھنے والے کامل انصاری جونپوری تھے۔ یہ اور دوسرے مضامین اپنی ادبی و تحقیقی خوبیوں کی وجہ سے علم عرفان کا عمدہ وسیلہ ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانا ہی چاہیے۔(ع۔ص)

رضوان احمد فاروقی، **عروس لفظ کا مسکن لکھنؤ**، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۲۱۶، قیمت: ۲۰۰روپے، سن اشاعت ۲۰۲۱ء، پتہ: دانش محل، جھنڈے والا پارک، امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸، اور عارف علی انصاری، بک سیلر، لطیف مارکیٹ، خیر آباد، سیتاپور، یوپی

یہ کتاب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں لکھنؤ کی شعری محفلوں کی روداد بالکل نئے انداز سے پیش کی گئی ہے، یہ محفلیں بھی گزشتہ لکھنؤ کی نہیں بلکہ موجودہ لکھنؤ کے رنگ ڈھنگ کی ہیں، لکھنؤ اب بھی اس حالت میں ہے کہ اس کے ذکر سے سینہ میں کوئی تیر چبھنے پر ہائے ہائے کے الفاظ نکالنے سے زبان انکار کر دیتی ہے۔ یہاں اب بھی شعر و سخن کی وہ محفلیں سجتی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ ماضی کو حال سے جوڑ کر مستقبل میں لکھنوی تہذیب کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا جائے۔ ان ہی محفلوں میں بزم صفی ہے جس نے خود کو جدید بنا کر یہ جدت کی کہ طرحی شعری نشستوں کو آزادی دی کہ شعراء جس بحر میں چاہیں غزلیں کہیں لیکن ردیف بہر حال متعین ہوگی، مثلاً لکھنؤ کو حرف ردیف بنایا گیا تو اس کا وجود اس قسم کے اشعار کی بارش سے نہال ہو گیا کہ:

دعویٰ ہے اور شہروں کو بھی ہند میں مگر
تہذیب کا ہے آج بھی معیار لکھنؤ
نفرت سے بغض و کینہ سے بیزار لکھنؤ
کرتا ہے سب سے پیار کا اقرار لکھنؤ
محفوظ جس میں آج بھی ہے نکتۂ وفا
وہ دائرے بنا گیا پرکار لکھنؤ
اہل زباں نے ایسا تلفظ عطا کیا
اردو زبان بن گئی سرکار لکھنؤ

لکھنؤ ہی نہیں زندگی، بادل، دھوپ، خوشبو، کتاب، ماں، منظر، محبت، ناممکن، ضرورت، رمضان جیسے عنوانوں پر جو شعری نشستیں ہوئیں، ان کی نہایت پر کیف رودادوں نے حال کے دریچوں کا رخ ماضی کے مناظر کی جانب اس طرح کر دیا کہ واقعی زبان پر یہ نعرہ خود بخود رقص کرنے لگا کہ ہے

عروس لفظ کا مسکن لکھنؤ۔

لکھنؤ اور دبستان لکھنؤ کے شیدائیوں کے لیے اس کتاب میں بہت کچھ ہے۔ساتھ ہی مولانا علاء الدین ندوی، سید عالم نقوی، انور جلال پوری، مخمور کاکوروی اور سید ضیاء الحسن جیسے سخن شناسوں نے بھی اپنی تحریروں سے کتاب کی لذت میں اضافہ کر دیا۔ انور جلال پوری نے صحیح لکھا کہ کتاب میں نہ بھولنے والی کوئی چیز ہے تو وہ تحریریں ہیں جنھیں پڑھ کر رضوان فاروقی کے قلم کو چوم لینے کو دل چاہتا ہے۔(ع۔ص)

کتب شناسی، مفتی شرف الدین عظیم الاعظمی، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۲۴ قیمت: ۳۰۰ روپے، پتہ: ادارہ علم و ادب، انوار جامع مسجد، گوونڈی، ممبئی اور مکتبہ ضیاء الکتب خیر آباد، موبائل: ۸۷۶۷۴۳۸۲۸۳

کتابوں پر تبصرے کا مقصد ظاہری طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ موضوع سے کتنا انصاف کیا گیا، مصنف کی غرض وغایت کو پورا کرنے میں کتاب کتنی کامیاب رہی، مصنف کے خیالات نے اسلوب کا کتنا ساتھ دیا، تحقیق اگر ہے تو وہ کتنی مستند اور قابل اعتبار ہے اور فنی اعتبار سے کتاب کس درجہ کی ہے اور یہ کہ کتاب کو قارئین کے لیے پرکشش بنانے بلکہ مطالعہ کے لیے بے قرار کرنے میں تبصرہ نگار کو کتنی کامیابی ملی ہے۔ تبصرہ نگاری پر گفتگو جب بھی ہوتی ہے تو تبصرہ، تعارف، تذکرہ، تقریظ، تنقید، تجزیہ، تعریف جیسے پہلوؤں کی بات بھی سامنے آجاتی ہے، تبصرہ نگار کے لیے یہ بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ کہ بہتر یہی ہے کہ جس موضوع میں اس کو مہارت حاصل ہو اسی کے تعلق سے کتابوں پر رائے ظاہر کی جائے، پھر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ تبصرہ طویل ہو یا مختصر ایسا نہ ہو کہ تعارف کسی طویل مقالہ کی شکل اختیار کرلے اور یہ بھی کہ مصنف کی علمی شان اور حیثیت بھی ملحوظ رہے، غرض ایک تبصرہ نگار کے لیے تبصرہ بجائے خود ایک امتحان بن جاتا ہے، اردو ادب میں اس امتحان میں کامیاب ہونے والے اور دوسروں کے لیے مثال بن جانے والے تبصرہ نگاروں کی کمی نہیں۔ رسائل وجرائد کی کثرت نے تبصرہ نگاری کو جہاں ایک مقبول صنف سخن بنایا، وہیں بڑے اہل قلم کی روش پر گامزن ہونے کا حوصلہ بھی قلم و قرطاس کی نئی پود کو عطا کیا۔زیر نظر کتاب بھی اسی شوق کے اظہار کا ایک خوشگوار وسیلہ ہے، جس میں مصنف نے اپنی پسندیدہ یا منتخب کتابوں اور رسالوں کے مطالعہ کی دنیا آباد کی اور دوسروں کو اس دنیا کی سیر کی فرحت سے شادکام ہونے کی فرصت بھی عطا کر دی، مصنف ابھی عمر کے دور شباب میں ہیں اس لیے جوش، زور اور قوت کا اظہار بھی ان کی تحریروں سے نمایاں ہے، شروع میں ڈاکٹر الیاس الاعظمی، مولانا شفیق احمد اعظمی و مولانا ضیاء الحق خیر آبادی اور مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی کے مقدموں اور تقریظوں سے مصنف کی تحسین اور حوصلہ افزائی تو ہوتی ہی ہے، فن تبصرہ نگاری پر بھی بہت سی قیمتی

باتیں ان میں آگئی ہیں، جن سے کتب شناسی کا عمل آسان تر ہو گیا ہے۔(ع۔ص)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، **افادات شبلی**، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۲۲۴، پتہ: مکتبہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، سن اشاعت، ۲۰۲۲، قیمت: ۳۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۸۵۷۳۶۴۵ ای میل: azmi408@gmail.com

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے علامہ شبلی پر تحقیق و مطالعہ کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا ہے۔ آئے دن ذکر و فکر شبلی کے نت نئے ابواب اور پہلوؤں کی تلاش و جستجو کی اس قسم کی دوسری مثال مفقود ہے۔ شبلی کی روح پر فتوح اپنے سیکڑوں دیوانوں میں اس دیوانے کی فرزانگی پر یقیناً ناز کرتی ہوگی جس نے اس کے گلشن علمی سے چن چن کر تازہ مہکتے پھولوں سے محفل علم و تحقیق اور شبستان شعر و ادب کو مہکانے اور سجانے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ شبلی پر ڈاکٹر صاحب کی اب تک ۳۶ کتابیں شائقین شبلی کے مطالعہ کی میز پر آچکی ہیں۔ کتابوں کے اس سرمایے میں ایک بھی کتاب ایسی نہیں جو شبلی کو نئے سرے سے جاننے پہچاننے، سمجھنے، سمجھانے کے لیے نئی نسل کے کام نہ آئے اور ان کے اندر شبلی کے توسط سے اپنے شاندار ماضی سے آشنائی کا جذبہ نہ پیدا ہو۔ زیر تبصرہ کتاب کا شمار بھی ان ہی تصنیفات میں ہے۔

نوادرات شبلی کے بعد خود ڈاکٹر صاحب کا گمان تھا کہ اب شبلی کی کسی اور تحریر و تقریر کی دستیابی کی توقع نہیں تاہم ان کی نگاہ تحقیق نے متعدد اہم و وقیع مقالات و خطبات اور نادر خطوط و مراسلات کو ڈھونڈ کر یہ ثابت کر دیا کہ یہ خیال خام تھا۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے شبلی کی وسعت نظری، بلند فکری، حاضر جوابی، ظریف المزاجی، کفایت شعاری، متنی تحقیق میں شبلی کی اولیت، انتظامی صلاحیت، ذوق خطابت، تقریظ نگاری، مغربی علوم وفنون، اعلیٰ وادنی یا انگریزی تعلیم کے متعلق شبلی کے مخصوص نظریات، متعدد تحریکوں اور علمی و تحقیقی اداروں سے ان کے مخلصانہ روابط اور ان کے کام کے اطوار و انداز پر شبلی کے تاثرات، اسلام کے متعلق مروجہ انگریزی کتابوں میں غلط معلومات کی تصحیح پر زور، علمی اسفار، برطانوی گورنمنٹ میں مفت لازمی تعلیمی بل پر مولانا کی رائے، مولانا عبید اللہ سندھی کے ادارہ نظارۃ المعارف القرآنیہ کا دورہ اور اس کے متعلق شبلی کا تاثر، ختم نبوت، تعلیم و تربیت، تصوف، مفت جبری تعلیم اور اصلاح تمدن وغیرہ پر ان کے خطبات، الفاروق اور سیرۃ النعمان کے تمل ترجموں وغیرہ سے متعلق بہت سی ایسی نادر معلومات اور ان کے مآخذ کا پتہ چلتا ہے جو عام دسترس میں نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف شبلی کے نگار خانۂ ذوق و تحقیق کی سیر کرائی ہے بلکہ ان تحریروں کے سیاق وسباق اور مفید حواشی و تعلیقات لکھ کر اس کی جلوہ نمائی میں مزید چار چاند لگا دیے ہیں۔ امید یہی ہے کہ افادات کی افادیت سے ہر عاشق شبلی بصد شوق مستفید ہوگا۔ (کلیم صفات اصلاحی)

پروفیسر آفاق حسین صدیقی، **اردو شاعری میں شخصی مرثیے**، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۲۴۰،

پتہ: بیت الثنا، ڈی ۱۳۶، فردوس نگر، پی جی بی ٹی کالج روڈ، بھوپال، ۴۶۲۰۰۱، سن اشاعت، ۲۰۲۲، قیمت: ۳۵۰، موبائل نمبر: ۹۲۲۹۶۷۳۳۸۸

اردو شاعری میں رثائی ادب کی مقبولیت کی اہم وجہ شروع سے اس صنف کی جانب شعرا کی خصوصی توجہ اور اس کے فروغ کی مسلسل کوشش ہے۔ اہل بیت سے عقیدت و محبت نے اس فن کی آبیاری کے لیے مزید راہ ہموار کی اور مرثیہ نگاری کی تاریخ میں ایک ایسے سنہرے اور نئے باب کا اضافہ ہوا جس میں دوستوں، ادیبوں اور قومی و ملی رہنماؤں کی اموات پر مرثیے کہے گئے۔ اس قسم کے مراثی کے لیے شخصی مرثیے کی الگ اصطلاح رائج ہوئی۔ مصنّف نے اس کتاب میں شخصی مرثیہ گوئی کی تاریخ اور اس کے عہد بہ عہد ارتقا کو اپنی تحقیق و مطالعہ کا موضوع بنایا اور اس ضمن میں نہ صرف مرثیے کی تاریخ، اس کی اقسام، اس کی روایت پر محققانہ گفتگو کی ہے بلکہ اردو کے ساتھ ساتھ اس کے پہلے باب میں یونانی، لاطینی، انگریزی، عربی اور فارسی زبانوں میں مرثیہ نگاری کا بالاختصار جائزہ بھی لے لیا ہے۔ دوسرے باب میں دور جدید سے پہلے کے عہد، تیسرے میں جدید ممتاز شعرا کے شخصی مراثی، چوتھے میں آزادی سے قبل اور پانچویں باب میں آزادی کے بعد نمایاں مشاہیر شعر و ادب اور سیاسی قائدین وغیرہ پر کہے گئے مراثی کا الگ الگ جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ چھٹے باب میں شخصی مرثیوں کی روایت و رواج کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت پر روشنی ڈالی ہے۔

دکنی ادب میں دستیاب شدہ پہلے شخصی مرثیہ کے متعلق مشہور ہے کہ یہ حضرت جانم نے اپنے والد میران جی شمس العشاق کی وفات پر ۱۴۹۹ء میں کہا تھا اور محققین نے دکن میں اردو شاعری کی ابتدا کا یہی زمانہ بھی قرار دیا ہے۔ اس سے شخصی مراثی کی ابتداء کے متعلق مصنّف کے اس خیال ”اردو شاعری کے آغاز کے زمانے سے ہی شخصیات کی وفات پر کہے گئے مراثی کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا“ (ص ۳۴) کو تائید حاصل ہوتی ہے۔ شمالی ہند میں قابل ذکر شخصی مرثیہ گوئی کی ابتداء غالب کے مرثیۂ عارف سے ہوئی جس کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ یہ درد و غم کے اظہار اور درد و غم کی حالت میں سوگوار کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کے بیان اور زبان و بیان کی اثر آفرینی و سوز و گداز کے لحاظ سے امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ باب سوم میں حالی، صفی لکھنوی، چکبست، سرور جہان آبادی، سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال وغیرہ کے شخصی مراثی کا مفصل جائزہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس ضمن میں شبلی کے اپنے بھائی محمد اسحاق پر اکلوتے مرثیہ پر مصنّف کی یہ رائے قابل ذکر ہے کہ ”گرچہ شبلی کے یہاں ہمیں صرف یہی ایک مرثیہ ملتا ہے لیکن یہ مرثیہ اپنی فنی اور معنوی خوبیوں کی بناء پر بہت سے مرثیوں پر بھاری ہے۔۔۔ مرثیہ کا ہر لفظ اپنی ترتیب اور تاثر میں مولانا شبلی کے غم کی سچی ترجمانی اور جذبات کی حقیقی عکاسی کرتا ہوا نظر آتا ہے“ (ص ۶۴-۶۵) مصنّف نے اس موضوع پر بھرپور مطالعہ کا ثبوت

فراہم کیا ہے۔ ان کی تحقیق میں اعتدال و توازن موجود ہے جو کسی رائے سے اختلاف کے وقت خاص طور پر نظر آتا ہے۔ کتاب لائق مطالعہ اور رثائی ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ (ک۔ ص اصلاحی)

مولانا عتیق الرحمن سنبھلیؒ، مرتب محمد اویس سنبھلی، **بزم رفتہ**، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات: ۲۸۰، پتہ: الفرقان بک ڈپو، ۱۱۴/ ۳۱، نظیر آباد، لکھنؤ، ۲۲۶۰۱۸، سن اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۳۲۰، فون نمبر: ۴۳۱۵۶۶۴-۰۵۲۲

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی ملک کے نامور مصنّف، مفسر اور بلند پایہ ادیب وصحافی تھے۔ ان کی پوری زندگی اشاعت دین اور پرورش لوح و قلم میں گذری۔ ان کی تاب ناک تصنیفی و علمی حیات کا ایک قابل تذکرہ باب وفیات نگاری پر مشتمل ہے۔ اپنے ۶۵ سالہ علمی سفر کے دوران انہوں نے ملک کی جن ۶۲ مقتدر، تاریخ ساز اور نمایاں ہستیوں کی وفات پر حزنیہ تحریریں الفرقان اور ندائے ملت، لکھنؤ میں شائع کی تھیں اب ان ہی کو ان کے نواسے مولانا محمد اویس صاحب نے "بزم رفتہ" کے نام سے سلیقہ سے مرتب کر کے اہل ذوق کے استفادہ کے لیے پیش کر دیا ہے۔ ان تحریروں کی خاص بات یہ ہے کہ یہ مصنّف کے ذاتی مشاہدات و تاثرات اور تعلقات پر مبنی ہیں، اس لیے تصنع اور تکلف سے بالکل پرے اور اوریجنل ہیں۔

جن لوگوں کے حالات حیطۂ تحریر میں لائے گئے ہیں ان میں زیادہ تر علمی، دینی، مذہبی، ادبی، طبی، سیاسی، تحریکی، ملی، فکری، تبلیغی اور تعلیمی و تدریسی شناخت کے حامل اشخاص تھے۔ انہوں نے یقیں محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کے جذبہ سے خود کو سرشار کیا تھا اور معاشرہ کو ان ہی ہتھیاروں سے فتح کر کے اپنا خاص مقام بنایا تھا۔ مصنّف نے ذاتی احوال و کوائف کے بجائے مرحومین کے ان صفات کو ابھارنے کی خاص طور پر کوشش کی ہے جن سے قاری کو ان کے اندر نمونہ واسوہ نظر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ قدر مشترک کے طور پر جو صفات تقریباً ہر شخص میں موجود ہیں وہ اس طرح ہیں کہ ان کی اکثریت نے اپنے عہد میں قوم وملت کی فلاح و بہبود کی خاطر جانیں لڑادی تھیں۔ ان کا ایمان و عزم پختہ تھا۔ صحیح معنوں میں انہوں نے مقصدِ زیست پالیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ ہر طرح کا ایثار و قربانی پیش کرنے کے لیے ہمہ وقت مستعد و تیار نظر آتے ہیں۔ ان کی دین داری، دانشوری، خوش اطواری، صلح جوئی، جفاکشی دوسروں کے لیے مثال تھی۔ اسی لیے ان مضامین کی افادیت واہمیت دیر تک محسوس کی جائے گی۔ شروع میں مرتب نے پیش نامہ اور تقریباً تیس صفحات میں صاحب کتاب کا مختصر مگر جامع سوانحی خاکہ بھی لکھا ہے۔ (ک۔ ص اصلاحی)

ڈاکٹر عطا عابدی، **بچوں کی کتابیں تعارف و تذکرہ (بہار کے حوالے سے)**، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲، صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۲۵۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۲ء، موبائل نمبر: ۹۹۳۴۲۹۶۷۷۳

یہ حقیقت ہے کہ خاندان، قوم اور ملک کے روشن مستقبل کا انحصار بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت پر منحصر ہے۔ تربیت میں بچوں کے ادب کی خاص اہمیت ہے کہ یہ گھر اور مدرسہ سے جدا ایک تربیتی اکائی ہے، لیکن بچوں کا ادب تیار کرنا آسان کام نہیں، اس کے لیے بچوں کی نفسیات سے واقف ہونا شرط اول ہے، جس کے بعد مواد اور اسلوب میں بچوں کی ذہنیت اور ان کے شوق کا سامان جمع کیا جاتا ہے۔

کتاب کے مصنف نے صحیح لکھا ہے:

بچوں کے لیے نظم و کہانی کے علاوہ مضامین اور زبان و قواعد کے پہلو بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں صرف ادب اطفال کی کتابوں تک محدود نہ رہ کر بچوں کے لیے دیگر حوالوں سے شائع کتابوں کے تعارف و تذکرے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ (ص ۱۱)

یہی نہیں مصنف کا یہ شعور بھی کتاب کو مفید بناتا ہے کہ:

بچوں کی کتابوں کے تذکرے کے پس پردہ بچوں کے لیے لکھنے والوں اور تعلیمی و تربیتی منصوبہ بنانے والوں کے سامنے صالح افکار و اقدار کی بنیاد پر بچوں کی نشو و نما کے لیے ایک سمت و رفتار کی نشان دہی مقصود ہے۔ کتابیں اپنے آپ میں اہم نہیں ہوتیں، کتابوں کو اہم بناتی ہیں، وہ اہم باتیں جو ان کا حصہ ہوتی ہیں۔ (ص ۱۱)

اس میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں کا تعارف بجائے خود ایک نہایت مفید کوشش ہے اور شاید اپنے موضوع پر یہ پہلی کوشش ہے، جس میں مصنف، مؤلف کے خانوں کے تحت ۹۶/ اہل قلم کی کتابوں اور مضامین اور نظموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

ان میں سید شہاب الدین دسنوی، عبد القوی دسنوی، اسلم جمشید پوری، مولانا نورالہدیٰ سیوانی، مناظر عاشق ہر گانوی، علقمہ شبلی، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن جعفری، پروفیسر طرزی اور عطا عابدی وغیرہ چند نمایاں نام ہیں، آخر میں ضمیمہ کے تحت متفرقات ہیں۔ مصنف عرصہ تک درس و تدریس سے وابستہ رہے اور کئی برسوں تک ماہنامہ افکار ملی نئی دہلی کے سب ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔ اس لیے تعلیم و تربیت کے پہلوؤں پر ان کی گہری نگاہ ہے اور صحافت سے وابستگی کی وجہ سے خیالات کی وسعت کو سلیقہ سے پیش کرنے کی مہارت بھی ہے۔

مجموعی لحاظ سے کتاب لائق مطالعہ ہے۔ البتہ اس میں جن اہل قلم کے مضامین شامل ہیں اگر ان کا مختصر تعارف بھی شامل کر دیا گیا ہوتا تو بہتر ہوتا۔ بچوں کے رسائل کا عمومی تذکرہ دقت طلب ہے، ایسے میں شائع ہونے والے بچوں کے رسالوں کا یہ مجموعی تذکرہ تیار ہو جائے تو ایک اچھی خدمت ہوگی۔ امید ہے اس کتاب سے دوسرے اہل قلم اور مصنّفین کو بھی تحریک ملے گی اور صوبۂ بہار کی طرح مختلف صوبوں میں ادبِ اطفال کے حوالے سے نئی تصویریں سامنے آسکیں گی۔ (فضل الرحمٰن اصلاحی)

ادبیات

نعت النبی ﷺ

وارث ریاضی

کاشانہ ادب، سکٹا (دیوراج) پوسٹ بسوریا، وایا، لوریا، مغربی چمپارن، بہار

اے صلِّ علیٰ رتبۂ سرکار مدینہ
ہر سمت ہے جگ مگ مہہِ آثارِ مدینہ

ہے رشک جناں رونقِ گل زارِ مدینہ
اللہ رے وہ گلشنِ بے خارِ مدینہ

ہے دل میں نشیں جلوۂ توحید و رسالت
چہرے سے عیاں ندرتِ افکار مدینہ

اے عفو و ترحُّم کے امیں، محسنِ عالم
اے داعیِ حق، پیکرِ ایثارِ مدینہ

جھکتے ہیں جہاں شاہِ عرب، شاہ عجم بھی
سرداروں کے سرتاج ہیں سردار مدینہ

دنیا یہ تباہی کے دہانے پہ کھڑی ہے
ہاں، ایک نظر مدحتِ گفتارِ مدینہ

میں چشمۂ طیبہ سے بھی سیراب ہوا ہوں
اے ساقیِ مَی خانۂ اَخیارِ مدینہ

پھر بندۂ عاجز پہ عنایت ہو الٰہی!
پھر امتِ عاصی ہے طلب گارِ مدینہ

اپنا جو تھا دنیا میں مجھے چھوڑ چکا ہے
اب کوئی نہیں اے شہہِ ابرارِ مدینہ

جائے گا کہاں آپ کا یہ وارثِ غم گیں؟
اس پر بھی کرم کیجیے غم خوار مدینہ

غزہ کہاں ہے؟

خالد ندیم، سرگودھا، پاکستان

غزہ کہاں ہے؟
غزہ یہیں ہے، مگر وہ اہلِ غزہ کہاں ہیں؟
چمن یہیں ہے، مگر وہ اہلِ چمن کہاں ہیں؟
شجر کہاں ہیں؟ ثمر کہاں ہیں؟
وہ طائرانِ چمن کہاں ہیں؟
وہ گل کہاں ہیں کہ جن کی خوشبو سے سارا گلشن مہک رہا تھا؟
فلک کہاں ہے؟
فلک یہیں ہے، مگر وہ اہلِ فلک کہاں ہیں؟
نجوم و مہر و قمر کہاں ہیں؟
کہاں ہے بادل؟ کہاں ہیں بارش؟
ہماری سب کھیتیاں کہاں ہیں؟
ہمارے بچے، ہماری بہنیں، ہماری مائیں بچھڑ گئی ہیں
نہ اہلِ خانہ، نہ اہلِ بستی
نہ در، نہ روزن، نہ گھر ہیں باقی
ہماری تقدیر میں نہیں ہے کہیں ٹھکانا، نہ آب و دانہ
ہمارے بچوں کی التجائیں
سمع خراشی ہی کر رہی ہیں
ہماری مانگی ہوئی دعائیں نہ جانے کس سمت جا رہی ہیں
کوئی پڑوسی، نہ کوئی بھائی
کوئی بھی سنتا نہیں ہماری
زمانے بھر میں ہمارا کوئی نہیں ہے باقی، نہیں ہے باقی
اُجڑ گئی ہیں ہماری فصلیں
کٹی پڑی ہیں ہماری نسلیں

معارف کی ڈاک

”ہندوستانی مدارس میں اردو زبان کی تعلیم: مسائل اور مواقع“

مارچ ۲۰۲۴ء کا معارف میں شائع شدہ مضمون ”ہندوستانی مدارس میں اردو زبان کی تعلیم: مسائل و مواقع“ از ڈاکٹر انیس الرحمٰن کا مقالہ بہت خوب ہے لیکن تجزیہ نادرست بھی ہے کیونکہ اس طرح کا عنوان یا موضوع اپنے جلو میں بہت سارے اطراف و اکناف رکھتا ہے جن کا مختصر سے مقالے میں حق ادا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے صوبۂ راجستھان کے ایک مشہور ادارے جامعۃ الہدایۃ کے رسالے ”ہدایت“ کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پندرہ روزہ ”تعمیر حیات“ کا تذکرہ تو کیا، لیکن اسی ادارے سے شائع ہونے والے رابطہ ادب اسلامی کے اردو ترجمان ”کاروان ادب“ کا نام نہیں لیا۔ دوسرے علماء کے شعری مجموعوں کا نام تو پیش کیا ہے لیکن علامہ شبلی کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مجموعۂ کلام ”ارمغان سلیمان“ سے دامن کشاں گزر گئے۔ امارت شرعیہ کے ترجمان ”لوح و قلم“ اور اب ”المجیب“ کا کوئی ذکر نہیں جبکہ اس رسالے کے کئی ضخیم و جسیم اور باتمکنت و باوقار خصوصی نمبرات بھی شائع ہوتے ہیں جن کے بالاستیعاب مطالعے کا داعیہ پیدا کرنے والے معارف کے ذوق آگیں و شوق آفریں تبصرے بھی نظر نواز ہوتے ہیں۔ یہی حال رام پور کے ایک قدیم ادارے کے ترجمان ماہنامہ ”ضیاءِ وجیہ“ کا بھی ہے جس کے ساتھ یہ صورت حال پیش آئی ہے۔ یہ موضوع ملک گیر پیمانے سے متعلق ہے جس کے مقتضیات و متطلبات کو موصوف بالکلیہ پورے نہیں کر پائے ہیں۔ اس لیے بہتر ہوتا کہ وہ اپنے اس مقالے کے لیے یہ عنوان منتخب نہ کر کے فضلائے دارالعلوم کی اردو خدمات یا اسی سے ملتا جلتا کسی اور عنوان کا انتخاب کر لیتے کیونکہ ان کے اس مقالے کے زیادہ تر مندرجات اسی ادارے کے ارباب فکر و فن اور اصحاب فضل و کمال کی اردو زبان اور ادب کے تعلق سے کی گئی خدمات جلیلہ کو محیط ہیں۔ بہر کیف ڈاکٹر انیس الرحمٰن کے ان چند فرو گذاشتوں کے باوجود مدارس اسلامیہ ہندیہ کی اردو زبان و ادب کی خدمات کی انجام دہی کے تعلق سے ان کا زیر تذکرہ مقالہ بہت خوب ہے اور خوب سے خوب تر کی گنجائش سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟

راجو خان، راجستھان

۹۱۲۲۷۸۰۱۹۸

رسید کتب موصولہ

معصوم مرادآبادی، **پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی تصنیفات اہل علم وادب کی نظر میں:** مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء، بادشاہ باغ، لکھنؤ، صفحات:۲۶۷، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت ۳۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۸۱۱۱۳۲۴۳۱

سید تنویر حسین، **اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات:** کتابی دنیا، ترکمان گیٹ، دہلی، صفحات:۲۲۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۳۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۸۶۸۷۸۱۹۶۴

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، **باقیات شعر شبلی:** مرکزی پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات:۱۲۸، سال اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت ۲۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۸۳۸۵۷۳۶۴۵

حشمت کمال پاشا، **بیسویں صدی میں مٹیابرج:** پاشا پبلی کیشنز، نواب واجد علی شاہ روڈ، گارڈن ریچ، کولکاتا، صفحات ۳۲۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت ۵۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۱۲۳۹۹۸۳۴۴

سید سہیل اختر (تشنہ اعظمی)، **ستارو! جاگتے رہنا:** دین دیال نگر، روپ پور، کھدرا، لکھنؤ، صفحات: ۱۷۶، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت ۴۲۵روپے، موبائل نمبر:۹۳۳۵۰۶۶۸۰۰

ڈاکٹر مشیر احمد، **ظفر احمد صدیقی، عکس و نقش** : راعی بک ڈپو، الہ آباد، صفحات:۴۰۷، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت:۵۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۵۶۰۷۸۶۲۹۸

محمد ساجد رضا مصباحی، محمد عارف حسین مصباحی (ترتیب و تصحیح)، **عرفان امام احمد رضا**، المجمع الاسلامی، ملت نگر، مبارک پور، اعظم گڑھ، صفحات: ۶۶۸، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: درج نہیں۔

محمد صابر حسین ندوی، **علامہ شیخ یوسف القرضاوی: مجاہدانہ زندگی اور تجدیدی کارنامے**، جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور، کرناٹک، صفحات:۲۴۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۵۰روپے، موبائل نمبر: ۸۱۲۰۴۱۲۳۹۲

پروفیسر عبدالحق، **غالب نئی تشکیل:** ہڈسن لائن، کنگس وے، کیمپ دہلی، صفحات:۲۴۳، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت:۴۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۳۵۰۴۶۱۳۹۴

ڈاکٹر شکیل احمد، **نشاطِ سفر:** بک امپوریم، پٹنہ، صفحات:۱۲۸، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت : ۱۶۰ روپے موبائل نمبر:۹۳۰۴۸۸۸۷۳۹

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبی (خاص ایڈیشن مکمل ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	125/-
مقدمہ سیرۃ النبی	30/-	سفرنامہ روم ومصر وشام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات شبلی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم اول	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم دوم	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم سوم	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم پنجم	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن)		انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-
تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی	350/-	مکاتیب شبلی اول // //	--
خطبات شبلی	150/-	مکاتیب شبلی دوم // //	190/-
الکلام	350/-	اسلام اور مستشرقین چہارم	
علم الکلام	200/-	(علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

SEPT 2024 Vol- 211(9) ISSN0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: info@shibliacademy.org